کتابِ دل و دنیا
Iqbal Mehdi
افتخار عارف

کتابِ دل و دُنیا

افتخار عارف

دانیال

ناشر : حوری نورانی

سرورق : اقبال مہدی

طابع : ذکی سنز پرنٹرز۔ کراچی

اشاعت : تیسری بار ۲۰۱۲ء

قیمت : ۹۵۰ روپے

KITAB-E-DIL-O-DUNYA

by

IFTIKHAR ARIF

ISBN: 978-969-419-028-0

PAKISTAN PUBLISHING HOUSE

Snowhite Mobile Centre, Opposite Jabees Hotel,
Mezzanine Floor, Abdullah Haroon Road, Karachi -74400
Phone: 35681457-35682036-35681239 Fax: 32627549
E-mail: danyalbooks@hotmail.com

وَلا مِیرَاثَ کَالاَدَب

ادب سے بڑھ کر کوئی میراث نہیں۔

(امیر المومنین علی ابنِ ابی طالب)

سلیم احمد، فیض احمد فیض اور مشتاق احمد یوسفی

کے نام

جز شعر، نہیں کوئی جوابِ دل و دُنیا
جیسی بھی ہے حاضر ہے کتابِ دل و دُنیا

ترتیب

باب عقیدت

باب غزل

بابِ نظم

باب فردیات

دیباچہ

سیاحتِ دل و دُنیا

افتخار عارف کی شاعری سے میرا تعارف تو دیرینہ نہیں ہے بلکہ جن چند ایک معاصر شاعروں کی بابت بہت دنوں سے، میں لکھنے کا ارادہ باندھتا ہوں، افتخار عارف اُن میں شامل ہیں۔ وائے مکروہاتِ زندگی کہ دن گزرتے جاتے ہیں اور ارادے عمل میں ظاہر ہونے سے قاصر رہتے ہیں۔ تاہم اب جو افتخار عارف کے کُل کلام کی اشاعت کا موقع آیا اور مجھ سے اس پر لکھنے کو کہا گیا تو مجھے کسی قدر تامل ہوا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جس شخص کی کتاب پر اُس کے عہد کی معروف و ممتاز شخصیات (مثلاً فیض احمد فیض، گوپی چند نارنگ، سیدابوالخیر کشفی) دیباچہ یا پیش نامہ لکھ چکی ہوں، اُس کے لیے دیباچہ نگاری کرتے ہوئے مجھ جیسا شخص بھلا کس نکتے کا اضافہ کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یوں بھی مجھے دیباچہ وغیرہ لکھنا نہیں آتا اور اس قسم کی تحریروں سے کچھ طبعی مناسبت بھی نہیں ہے۔ تیسری اور اہم ترین بات یہ کہ افتخار عارف کی شاعری کی بابت میری جو بھی رائے اور تاثرات ہیں، میں وہ رسمیات سے بالاتر ہوکر لکھنے کا خواہاں ہوں — جب کہ دیباچہ قسم کی تحریریں بعض چشم پوشیوں کی مکلف سمجھی جاتی ہیں۔ سو خیال ہوا کہ اس وضع کو نبھانے میں ممکن ہے میں اُس طور سے اپنی بات ہی نہ کہہ پاؤں کہ جیسے کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن پھر یہ سوچا کہ افتخار عارف کو اب کسی دیباچے کی ضرورت ہے اور نہ ہی مجھے دیباچہ نگاری کا شوق پورا کرنا ہے، سو اپنی کہنے میں آخر کیا امر مانع ہے۔ چناں چہ اب یہ ہے کہ اس خامہ فرسائی کو دیباچہ کہا جائے یا کچھ اور، لیکن میں آئندہ سطور میں بس وہی بات

کہنے کی کوشش کروں گا جو افتخار عارف کی شاعری کے ضمن میں کہنا فی الاصل مقصود ہے۔

افتخار عارف معاصر اردو شاعری کا ایک ایسا معروف نام ہے جس کی انفرادی شناخت کے نہ صرف خدوخال واضح ہیں بلکہ جسے اعتبارِ سخن کی سند بھی عوام و خواص دونوں ہی سے مل چکی ہے۔ ایک طرف مشاعرے کی تہذیب سے واقف اہلِ ذوق اُن کے کلام کو سراہتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف اہلِ نظر اُن کی قدردانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس گئے گزرے زمانے میں یہ اعزاز ایسا بھی ارزاں نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس کو مل جائے۔ عصری شعری منظرنامے پر ایک نگاہ اور افتخار عارف کے کلام کا اجمالی مطالعہ بھی اس امر کی تصدیق کے لیے کافی ہوگا۔

آج جب افتخار عارف کے شعری سرمائے کو ہم اُس کی کلّیت میں دیکھتے ہیں تو دوسری سب باتوں سے پہلے ہماری توجہ ایک خاص نکتے پر از خود مرکوز ہوتی چلی جاتی ہے — اور وہ ہے اعترافِ حقیقت یا اظہارِ احوال کا مسلسل بیان۔ یوں تو ہر سچا شاعر اپنے فن میں دراصل خود اپنی ہی روح کی آواز کو پانے کی جستجو کرتا ہے۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اپنی اصل آواز تک پہنچنے سے قبل تخلیق کار کو روح کے مہیب اور سنسناتے صحراؤں سے گزرنا پڑتا ہے اور اپنی انا کے کتنے ہی بے در گنبدوں کو ڈھا کر کھلے آسماں تلے آ کر اُس آواز کو دریافت کرنا پڑتا ہے جو بسا اوقات اتنی مہین ہوتی ہے کہ اسے اطراف کی آوازوں سے الگ کر کے پہچاننا بھی دُشوار ہوتا ہے — یہ سارا تجربہ اس قدر ہولناک ہوتا ہے کہ اکثر ادیب شاعر اِس کی تاب نہیں لا پاتے اور اس جستجو سے ہی دستبردار ہو جاتے ہیں۔ کچھ حوصلہ مند آگے بڑھتے ہیں تو انھیں یہ ماجرا بھی پیش آتا ہے کہ وہ اپنی اصل آواز سے پہلے انا کے طلسمی گنبدوں سے آتی غیر حقیقی آوازوں میں سے کسی ایک کو اصل سمجھ کر اپنے سینے میں اُتار لیتے ہیں۔ یہ دونوں ہی صورتیں ظاہر ہے، ناکامی کی صورتیں ہیں۔ ہاں کچھ لوگ بہرحال ان مراحل سے ثابت قدمی سے گزرتے ہیں اور اپنی اصل کو شناخت کرتے اور پھر جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف کی اردو شاعری کے ایسے ہی شاعروں میں افتخار عارف بھی شامل ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ شاعری میں اعترافِ حقیقت یا اظہارِ صداقت کے کیا معانی ہوتے ہیں؟ وہ خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اتنی بات بہر حال طے ہے کہ یہ معانی بعینہٖ وہ نہیں ہوتے جو زندگی میں اس قبیل کے تجربات سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ یہ بحث تو بہت پرانی ہوچکی اور آج بڑی حد تک متروکات میں شمار ہوتی ہے کہ زندگی کے تجربات اور ان سے ماخوذ تصورات کا ادب سے کیا رشتہ بنتا ہے اور اُن کے باہمی اطلاقات کے درجے کس طور بدلتے ہیں۔ تاہم یہاں اس امر کے اعادے میں کچھ ایسا مضائقہ نہیں کہ ادب میں سچائی اور حقیقت کی پیمائش جس اسکیل پر ہوتی ہے وہ اسے larger than life ماپتا ہے۔ یہاں نظریے بازی کا شوق پورا کرنا مقصود نہیں اس لیے ہم کسی نظریے کے دفاع اور کسی کے استرداد سے حذر کرتے ہوئے براہ راست اپنے موضوع کی طرف بڑھتے ہیں — لیکن اس سے قبل یہ واضح کردینا چاہیے کہ سطورِ بالا میں جو سوال سامنے آیا ہے، اُس کی بابت سوچنے یا یوں کہیے کہ اُسے ایک بار پھر پوچھنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ جب ہم ایک ایسے تخلیقی اور بالخصوص شعری تجربے کو سمجھنے کے خواہاں ہوں جس میں شاعرانہ احساس اپنی داخلی صلابت سے ظواہر کی سطح کو توڑ کر حقیقت تک پہنچنے اور اُسے معرضِ بیان میں لانے کا خواہاں نظر آتا ہو تو اُس کے تحلیل و تجزیے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے صحیح تناظرات قائم کرکے شعری حقیقت اور اُس کی ماہیت کا تعین بہر طور کرلیا جائے۔ چناں چہ افتخار عارف کی شاعری کی بابت سوچتے ہوئے اور اس پر کچھ لکھنے لکھانے کی نیت باندھتے ہوئے میرے ذہن میں یہ سوال اس لیے آیا کہ اُن کا شعری تجربہ جن موضوعات، مسائل اور احساسات سے مرکب ہے وہ حقیقت کی جستجو اور سچائی کے اظہار میں اپنی الگ نوعیت رکھتے ہیں — اور میرا خیال یہ ہے کہ اس نوعیت کو سمجھے بغیر افتخار عارف کی شعری معنویت کا ادراک ہوسکتا ہے اور نہ ہی اُس کی فنی اور اسلوبیاتی قدر و قیمت کا تعین۔

جدید عہد نے انسانی آزادی اور اس کی خودمختاری کے یوں تو کیا کیا نعرے نہیں لگائے لیکن سچ یہ ہے کہ مہذب اور متمدن آدمی کی زندگی کا انحصار کچھ ضوابط و قواعد پر ہی ہوا کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ شاعر کی نظر، حس، ادراک اور شعور کی سطح عام آدمی سے مختلف یا زیادہ قوی ہوتی

ہے لیکن وہ انسانی زندگی کے لوازم کی نفی پر تو بہر حال منحصر نہیں ہوتی۔ دیکھیے بات یہ ہے کہ سارے اخلاقی ضابطوں اور تہذیبی قاعدوں کی نفی کرتے ہوئے اگر جبلّی خواہشات کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو فرانس کے ایک بے حد ذہین لیکن گم کردہ راہ شاعر راں بو کے بقول انسان کی زندگی سراسر دوزخ کی مثال بن کر رہ جائے گی۔ خیال رہے کہ یہ راں بو فرانس کا وہی شاعر ہے جس نے یورپ کے جدید ادب پر بودلیئر کے بعد سب سے زیادہ اثرات چھوڑے ہیں — اور یہ راں بو ہی تھا جس نے حواس کو مختل کر کے اور محسوسات کو آپس میں گڈمڈ کر کے حقیقت کو پانے کا سوال اٹھایا تھا۔ چناں چہ اوّل اوّل جبلت کی منہ زور قوتوں کا تجربہ کرنے کے بعد آخر آخر وہ اِس نتیجے تک پہنچا کہ انسانی زندگی کو جہنم کے تجربے سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ بہرطور کسی اخلاقی ضابطے اور تہذیبی قاعدے کو subscribe کرتی ہو۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ شاعر کو عارف بھی ہونا چاہیے۔ بہر حال یہ ایک الگ بحث ہے اور ان حوالوں پر ہم آگے چل کر ان کے مقام پر بات کریں گے۔ تو ذکر تھا افتخار عارف کے شعری تجربے کا۔

افتخار عارف کی شخصیت کے بارے میں تو بے شک ایک بلکہ کئی ایک سے زیادہ آرا پائی جاتی ہیں لیکن اُن کے شعری ہنر کی بابت ایک ہی رائے ہمارے سامنے آتی ہے، اور وہ یہ کہ اقلیمِ حرف وسخن میں بھی اُن کا سفر ویسا ہی شاد کام و منزل شناس رہا ہے جیسا کہ زندگی کے ہفت خواں میں۔ افتخار عارف کی شخصیت اور فن کے حوالے سے یہ ایک عام تاثر ہے اور بادی النظر میں یہ بات درست ہی نظر آتی ہے لیکن اگر ہم اِس باب میں باطنی شواہد کو درخورِ اعتنا جانتے ہوئے خود افتخار عارف کی شاعری سے جواب طلب کریں تو وہ اس رائے کے ایک حصے کو درست قرار دے گی اور دوسرے کو غلط۔ اس بیان کا جو حصہ درست ہے پہلے ذرا اُسی کو سمجھ لیتے ہیں، اس لیے کہ اُس کا معاملہ بالکل سیدھا سادا ہے۔ نسبی اور موروثی حوالوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اگر افتخار عارف کی ذاتی زندگی کو دیکھا جائے تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُن کی زندگی اک جہدِ مسلسل سے عبارت ہے -- اور زندگی کے میدان میں اُن کا سفر شاعروں کی عمومی صورتِ حال کے برعکس کامرانی سے عبارت رہا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ کامرانی کے ایک بسیط اور قابلِ رشک سلسلے سے۔ زندگی بنانے اور دُنیا کو پانے کی جدوجہد میں وہ ایک کے بعد

دوسرا میدان مارتے اور یکے بعد دیگرے نئی منزلیں سر کرتے چلے گئے۔ لہٰذا اس تگ و تار میں ان کی کامیابیاں بلاشبہ مثالی درجے کی شمار ہوں گی۔ یہ تو ہوئی زندگی کی بات۔ اب جو دیکھا جائے تو شاعری اگر اُن کی زندگی سے کوئی مماثلت اختیار کرتی ہے تو بس یہی کہ اُنھوں نے جب اس وادیِ طلسمات میں قدم رکھا تو یہاں بھی ایک کے بعد دوسری مہم کو سر کرتے ہوئے اس کے صدر تک جا پہنچے۔ صدر جو شرف کا گھر اور اعتبار کی منزل ہے۔ لیکن افتخار عارف کی شخصیت اور شاعری سے متعلق یہ تو وہ حکایت ہے جو ہم ظواہر کی زبانی سنتے ہیں۔ اس ساری دوا دوش میں آخر کچھ تو شاعر کے باطن پہ بھی گزری ہوگی، سو پھر اُس کا بھی تو کچھ حال کھلنا چاہیے۔

اصل میں وہ لوگ جو کامیابی کی منزلیں سر کرتے چلے جاتے ہیں، اُن کا خارج نمایاں سے نمایاں تر اور داخل رفتہ رفتہ موہوم و معدوم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ بس پھر یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ سامنے ہو اور نظر آتا ہو وہی اُن کا اصل سمجھ لیا جاتا ہے۔ سو یہی کچھ ماجرا افتخار عارف کو بھی پیش آیا۔ اور کیوں نہ آتا کہ افتخار عاف کا اپنا منشا بھی تو آخر کو یہی ٹھہرا کہ نہ وہ سب کے ساتھ ایک طرح سے رہ سکتے ہیں اور نہ ہی رہنا چاہتے ہیں۔ اب اگر انھوں نے لوگوں کی اور ان سے اپنے روابط کی درجہ بندی کی ہوئی ہے تو پھر لوگوں کو بھی تو یہ حق ہے کہ جو انھیں جیسا جانے ویسا ہی مانے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ اپنی سماجی رسم و راہ کے آغاز میں بھی افتخار عارف ایسے ہی رہے ہوں گے لیکن یہ کہنے میں مجھے باک نہیں کہ کم و بیش اپنی زندگی کا دوسرا نصف تو انھوں نے اُسی وضع کا گزارا ہے جسے ظاہر کا جلوہ کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے گرد کچھ تو وقت اور کچھ لوگ بھی قصوں اور کہانیوں کا ایک جالا سا بن دیتے ہیں۔ یہ جالا ریشم کے کیڑے کے جالے جیسا ہوتا ہے — مہین، نازک اور ملائم۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ کامیاب و کامران آدمی جانتے بوجھتے ہوئے از خود اس جالے میں لپٹتا چلا جاتا ہے۔ وہ اس کو اپنی عافیت گاہ سمجھنے اور اس سے لطف لینے لگتا ہے۔ لیکن کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ خود تو اس جالے میں گرنے اور لپٹنے سے بچتا ہے لیکن دیکھنے والی آنکھیں اُسے ایک پردے کے اُدھر اور ایک دُھند میں ملفوف دیکھتی ہیں۔ تب اُنھیں اس دھند اور فاصلے کی تعبیر و تفسیر کی ضرورت پیش آتی ہے اور یوں قصے کہانیاں جنم لیتے ہیں۔ افتخار عارف کے ساتھ یہی دوسری قسم کی واردات گزری ہے۔ اس

حوالے سے دیکھیے تو اُن کی زندگی میں کہیں قربتوں کے فسانے ہیں تو کہیں فرقتوں کے قصے۔ کہیں ناز و نخوت کا چرچا ہے تو کہیں نیاز و انکسار کی شہرت۔ کہیں دُنیا داری کی کہانی ہے تو کہیں دل داری کی داستان — اس پر لطف یہ کہ ہر داستان طویل ہے اور ہر قصہ دراز۔

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ افتخار عارف نے اپنے گرد ریشم کا یہ جال خود تو چاہے نہ بنا ہو لیکن اِس دُھند سے اُدھر بیٹھے ہوئے لوگوں کی قیاس آرائیوں اور فسانہ طرازیوں سے انھوں نے لطف ضرور لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قیاسات کے اس دُھند لکے سے اپنی شخصیت کو الگ کر کے دکھانے کی کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی۔ ہاں ٹھیک ہے، کرنی بھی نہیں چاہیے تھی۔ آخر آدمی کب تک دُنیا کے اندیشہ ہائے دُور و دراز میں دُبلا ہوتا رہے۔ تو اب ایسا ہے کہ وہ ایک وسیع المشرب آدمی ہیں اور زندگی اک ٹھکانے اور ڈھنگ سے گزارتے ہیں۔ وہ تارک الدنیا نہیں، دُنیا اور اس کی آسائشوں سے خوب سرکار رکھتے ہیں۔ نام و نمود سے بھی انھیں گہری دلچسپی ہے۔ تو یوں ہے کہ وہ دنیا پر مائل ہیں اور دنیا اُن پر مہربان۔ سو کوئی ٹھکانا ہے شادکامی و آسودہ خاطری کا۔ سوچیے کہ ایک ایسا آدمی جو آسودہ حال دکھائی دے اور قہقہہ بار سنائی دے پھر اسی پر موقوف نہیں، ان کی بزم آرائی، حلقۂ یاراں ہی میں نہیں، اس سے باہر بھی بسا اوقات حد سے بڑھی ہوئی فقرے بازی، احباب سازی اور نکتہ طرازی — غرض کوئی ایک زاویہ، کوئی ایک رُخ تھوڑی ہے افتخار عارف کے بارے میں بات کرنے اور سوال اٹھانے کا۔ تو کہیے کہ ایسے آدمی کا ظاہر آخر اس کی روح کا پردہ کیوں نہیں بنے گا۔ میری افتخار عارف سے مدت العمر کی دوستی تو خیر نہیں ہے لیکن ان پندرہ سترہ برسوں میں جو صاحب سلامت اُن سے رہی ہے، اُس کو مستحضر حافظے میں رکھتے ہوئے اگر میں یہ کہوں کہ میں نے انھیں بعض لمحات میں گرفتہ دل بھی دیکھا اور کبھی آہِ سرد کھینچتے ہوئے بھی پایا تو کتنوں کو یہ جان کر شاید تعجب ہی نہ ہو بلکہ ممکن ہے کہ ماننے میں تامّل بھی ہو۔

آدمی کی مٹی بھی عجیب متضاد خواص رکھنے والے عناصر کا آمیزہ ہے۔ کبھی تو یہ چھاجوں مینہ برساتے بادلوں کی اوٹ سے روپہلے سورج کی ڈھلی کرنیں مانگنے چل نکلتی ہے اور کبھی گرداگرد ہمکتی ہمہماتی دُنیا سے سارے ربط و ضبط کے باوجود اپنی تنہائی کی فصل اُٹھانے

میں لگی رہتی ہے۔ اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے عجیب۔ دھیان آتا ہے کہ دل کا حال بدلتی اور احساس کے رنگوں کو متغیر کرتی اسی کیفیت کا بیان ہی تو لگ بھگ رُبع صدی پہلے وہ دروازہ بنا تھا جس سے میں افتخار عارف کی شاعری کے اس طلسم کدے میں داخل ہوا تھا۔ تب اوّل اوّل کی حیرت کے زیرِ اثر میں نے سوچا تھا کہ افتخار عارف کی شاعری دل کے ماجرے کا بیان ہی تو ہے۔ یہ جو ایک آدمی اُن کی شاعری میں تقدیر کی پتوار تھامے داخلی احساس کی ہزیمت کے تھپیڑے کھاتا دل و دُنیا کے مرج البحرین میں ڈوبتا ابھرتا چلا جاتا ہے، یہ تو مجھے کہیں بعد میں جا کر دکھائی دیا تھا۔ پہلے پہل تو افتخار عارف کے یہاں دل اور دل داری کا قصہ ہی نظر پڑتا تھا۔ یہ قصہ بھی عجب طور سے اُن کے یہاں بیان ہوا تھا۔ اس میں ہجر کا ملال، وصل کی سرخوشی، عاشقی کی صبر طلبی اور تمنا کی شادکامی — غرض کئی رنگ بہ یک وقت جھلکتے تھے اور لطف یہ کہ ہر رنگ اپنی جگہ ان کی شاعری کا سب سے گہرا اور اصل رنگ معلوم ہوتا تھا۔

یہ افتخار عارف کی شاعری کا پہلا تاثر تھا جو عام ہوا۔ سچ یہ ہے کہ میں نے بھی اسی تاثر کو سب سے پہلے قبول کیا تھا۔ بعد ازاں جب اُن کے سخن کے دوسرے رنگ کھلے تو معلوم ہوا کہ قصہ صرف دل کا نہیں ہے، بلکہ یہاں تو آدمی دل و دنیا کے بیچ بٹا ہوا ہے۔ گویا ایک نہیں، دو مرکزِ ثقل ہیں افتخار عارف کی شاعری کے اور دونوں مخالف سمتوں میں ہیں اور بہ یک وقت اور یکساں قوت سے شاعر کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ تب میں نے غور کیا تخالف کا یہی رشتہ اور تضاد کی یہی قوت مل کر افتخار عارف کی شاعری کو سینچتے ہیں، اور اسے نمو دیتے ہیں۔

مجھ سے پوچھیے تو افتخار عارف کی شاعری دراصل اسی ماجرے کا بیان ہے۔ روایانِ روایت کا کہنا ہے کہ افتخار عارف کی زندگی میں معاملہ بندی اور دل داری کا سلسلہ دراز رہا ہے۔ ادھر واقفانِ حال کہتے ہیں کہ اُن کا سفرِ حیات ایک ambitious آدمی کی تگ و تاز سے عبارت ہے۔ اب یہ معاملہ تو بقولِ سودا:

کیا جانیے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

والا ہے۔ جس نے انھیں جس آن میں دیکھا اُسی آن کے حال کی گواہی دی۔ اب یہ گواہی تو جو ہے سو ہے، اس کے علاوہ بات یہ بھی ہے کہ افتخار عارف کی ذات کے یہ جو دو رُخ ہیں، یہ

دونوں اپنی جگہ حقیقی ہیں۔ یہ جو دُنیا کی طلب ہے ان کے اندر، یہ بھی حقیقی ہے اور پوری شدت سے ہے اور وہ جو دل اس دُنیا اور اس کے علائق کو رد کرتا ہے، اس رشتہ و پیوند کو ہیچ گردانتا ہے، دُنیا داری اور جاہ پسندی کو خواہشِ نفس جانتا ہے، وہ بھی اپنی جگہ سچ ہے۔ یہ دونوں ہی ان کی شخصیت کے داعیے ہیں۔ اس لیے یہ دونوں رنگ ان کی شاعری میں بین بین نظر آتے ہیں۔

جہاں تک سوال ہے دل داری اور عشق کا تو میں یہ تو خیر نہیں کہتا کہ افتخار عارف نے زندگی میں کوئی عشق نہیں کیا ہوگا، لیکن یہ چنگاری ان کے یہاں کہیں شعلۂ جوالہ بنتی دکھائی نہیں دیتی۔ یوں لگتا ہے کہ انھوں نے جو بھی عشق کیے سب کچے، ادھورے اور برائے بیت تھے۔ اب اس سے اگر کسی کی دل شکنی نہ ہو تو میرا خیال یہ ہے کہ انھوں نے زندگی میں سچا، کھرا اور پوری جاں سپاری کے ساتھ بس ایک ہی عشق کیا ہے — لیکن یہ معاملہ کسی پری چہرہ یا شمشاد قامت سے نہ تھا بلکہ ٹوٹ کر عشق تو انھوں نے صرف اور صرف اپنے آپ سے کیا ہے اور اس عشقِ ذات کا سب سے نمایاں پہلو ان کی شاعری کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ وہ اپنی نہاد میں صرف شاعر ہیں، کھرے اور سرتاپا شاعر۔ وہ جو اُن کے معاشقوں کا چرچا ہوتا ہے، وہ تو سب برائے شعر گفتن ہیں، صرف دل لگی کا سامان ہیں۔ ان میں سے ایک بھی جاں گدازی کے مرحلے کو پہنچتا نظر نہیں آتا اور نہ ہی تیرِ نیم کش بن کر شاعر کے دل میں ترازو ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں افتخار عارف کے یہاں عشق کی سپردگی کہیں نظر نہیں آتی۔ ہاں ایک چارٹر آف ڈیمانڈ نظر آتا ہے کہ انھیں ایک ایسے ساتھی کی تلاش ہے جو ان کے مزاج کے سب موسموں اور وحشتوں میں ساتھ نبھائے۔ یہ چاہے جھوٹ بولیں مگر وہ ان کے ساتھ سچا ہو۔ یہ آزاد ہوں مگر وہ ہر طرح صرف اور صرف انھی سے وابستہ و پیوستہ ہو۔ ماننا چاہیے کہ یہ کسی عاشق کے نہیں بلکہ اس شاعر کے مطالبات ہیں جو صرف اپنے شعلۂ سخن کو زندہ رکھنے کا سامان چاہتا ہے۔ ایسا کیوں ہے، اس کا جواب واضح اور دوٹوک ملتا ہے افتخار عارف کی شاعری میں — اور وہ یہ کہ عشق کی چادر پورا تن ڈھانپ ہی نہ پائی، وصالِ یار قرار دے ہی نہ سکا، اور جو وحشتِ دل تھی وہ دور نہ ہوئی، جو غبار تھا کہیں اندر وہ نکل ہی نہ پایا:

ہم ہوئے بھی مگر دِل کی وحشتیں نہ گئیں
وصال میں بھی دِلوں کا غبار کب نکلا!

تو بس سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جو وحشتِ دِل تھی اور غبارِ جاں تھا اسی کے بل پر شعلۂ سخن زندہ رہا۔ گویا کسی محبوب سے نہیں، بلکہ صرف اپنی شاعری سے افتخار عارف نے نبھائی ہے اور خوب نبھائی ہے، پورے خلوص اور وارفتگی کے ساتھ۔ خوش قسمتی سے جواباً شاعری نے بھی ان سے وفا کی۔ چنانچہ جو پھول اِس نے ان کے دامن میں ڈالے وہ شاخِ سدا بہار کے تھے۔

رہی بات زندگی کے میدانِ کارزار میں تگ و تاز کی تو یہ قدرے سنجیدہ معاملہ ہے اور ہمیں اس کی بابت گفتگو ذرا شرح و بسط کے ساتھ کرنی پڑے گی۔ تو اب یوں ہے کہ افتخار عارف نے دُنیا بنائی، بنانی چاہی اور وہ اس میں کامیاب رہے۔ کہا تو یہی جاتا ہے کہ یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا لیکن میں بلا تامل گواہی دوں گا کہ میں نے افتخار عارف کو ایک سے زیادہ بار اِس امر پر حالتِ شکر میں دیکھا ہے کہ دُنیا میں انھیں اُن کا حصہ آرزو سے کم نہیں ملا ہے۔ اور اس نکتے کی صراحت میں بھی چنداں مضائقہ نہ ہوگا کہ میں نے انھیں اس احساسِ تشکر سے مغلوب کسی مذہبی کیفیت میں نہیں بلکہ ایسے عالم میں دیکھا ہے جب انسان ایک سانس میں دُنیا کو اپنے اندر اُتارتا اور دوسرے میں کچھ اور سمیٹ کر اندر لے جانا چاہتا ہے — یعنی اُس وقت جب وہ بشری تقاضوں کو سمجھتا، انھیں اہم گردانتا اور ان سے مغلوب ہوتا ہے۔ تو چلیے دُنیا کو افتخار عارف نے پالیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس دنیا نے اُن کی شاعری کو دیا کیا؟

سطورِ گزشتہ میں ہم نے ایک جگہ افتخار عارف کی شاعری کی بابت ایک عمومی تاثر بیان کیا تھا کہ اس میدان میں بھی اُن کا سفر ویسا ہی رہا ہے جیسا زندگی کے ہفت خواں میں — اور کہا تھا کہ اس بیان کا ایک حصہ درست ہے اور دوسرا غلط۔ درست کی وضاحت تو کی جا چکی، غلط کیا تھا، اب اُسے دیکھتے ہیں۔

دیکھیے، کسی خیال، عمل یا شے کی کسی شخص کی زندگی میں معنویت کا تعین اس امر سے ہوتا ہے کہ اُس کی طرف وہ شخص رویہ کیا اختیار کرتا ہے۔ اسی سے اُس کے وجودی تجربے کی نوعیت واضح ہوتی ہے اور ذہنی واردات تشکیل پاتی ہے۔ یہی رویہ اُس کے تئیں زندگی کی ماہیت بھی

طے کرتا ہے۔ فرد کا یہ رویہ اصل میں ایک ایسے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے جو زندگی کے شش جہات عمل کی اُس بنیاد کو دریافت کرتا ہے جو اس کو ایک مربوط سلسلے اور اکائی کے ضابطے میں متشکل کرتا ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی میں افتخار عارف کا رویہ ایک سائل کا ہے اور شاعری میں ایک صوفی کا سا۔ سو واقعہ یہ ہے کہ زندگی میں دُنیا اُن کا مقصود نظر آتی ہے جب کہ شاعری میں اِس دنیا کی حقیقت اُن پر کھل جاتی ہے، تب وہ اس حاصلِ زندگی کو ہیچ جانتے، اس کی فرومائگی کا اعتراف کرتے اور اس کی طلب پر نفرین بھیجتے دکھائی دیتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ دونوں رویے دو متخالف جہتوں میں عمل کرتی قوتوں سے عبارت نظر آتے ہیں۔ اور عامۃ الناس کی سطح پر انسانی ذہن کی dichotomy کا یہ فہم کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ عام آدمی کے دائرۂ کار میں اشیا کی تفہیم کا اصول ان کے ظہور یعنی مادّی وجود کے تجربے سے قائم ہوتا ہے جب کہ فن کار کا ذہنی تجربہ اُس کے وجودی تجربے پر بالقوہ سبقت رکھتا ہے۔ اس لیے یہاں اشیا کی تفہیم اصولِ ظہور سے نہیں بلکہ اصولِ خفا سے ہوتی ہے۔ طریقت میں خفا پانچویں درجے میں آتا ہے اور یہ درجہ روح سے اگلی منزلوں کا ہے۔ تو یہاں اشیا اپنی خارجی ہیئت سے نہیں داخلی احتیاج سے معانی اخذ کرتی ہیں۔

گرڈجیف نے اپنے نفسیاتی ضابطے میں اس نقطے کو اُبھارا ہے کہ شاعر (فن کار) کے اندر کسی نہ کسی درجے کا ایک صوفی بھی ہوتا ہے۔ ایلیٹ نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک بات کہی ہے، یہ کہ معنی خیز شاعری کے لیے صرف نیکی اور رحم دلی کے احساس اور جذبے کی فراوانی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے آدمی میں ذہنی اور روحانی صلاحیتیں بھی ہونی چاہییں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شاعر کے نصاب میں وظیفے پڑھنا اور چلّے کاٹنا شامل ہونا چاہیے تاکہ وہ روحانی منزلیں طے کر سکے اور وجودی تقاضوں سے اور مادّی ضرورتوں سے مبرّا ہو سکے، نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اُسے زندگی کے تجربے کو دیکھتے اور اُس پر سوچتے ہوئے اپنے اندر ایک ایسا دریچہ کھولنے کا ہنر بھی آنا چاہیے جو physical reality سے آگے non physical reality کا منظر دکھاتا ہے۔ یہاں وجود کا شعور بھی تبدیل ہوجاتا ہے اور اس کی معنویت بھی۔ اب انسان پر اپنی حقیقت منکشف ہوتی ہے اور خدا اور کائنات سے اپنے رشتے کی نوعیت بھی۔

یہ انسان کو اُس کے قدری تناسبات سے جاننے اور زندگی کو اس کے غیر مادّی حقائق کے ذریعے سمجھنے کا عمل ہے۔ انقلاب در انقلاب برپا کرتے ہوئے برق آسا تغیرات کے اِس دور میں تہذیبی عناصر اور انسانی اقدار کا جس طرح ملیامیٹ ہوتا چلا گیا ہے اُس نے آج کے شاعر کو یہ بات تقریباً بھلا دی ہے کہ جذبے اور تعقل کے زور پر بھی کچھ نہ کچھ اچھے شعر تو بے شک نکالے جا سکتے ہیں لیکن وہ اپنی بلند ترین سطح پر بھی اُس معنویت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے جو انسانی روح کے کسی داعیے کو سمجھنے یا ورائے وجود حقیقت کو پانے سے روشن ہوتے ہیں۔

افتخار عارف کے یہاں احساس اور شعور کی یہ جو دو رَویں (جن کا ایک نام دل و دنیا بھی ہے) بہ یک وقت چلتی ہیں اور ظاہراً باہم درآویزاں خطوط کی طرح ایک دوسرے کو کاٹتی نظر آتی ہیں، دیکھنا چاہیے کہ ان کی معنویت اُن کے شعری تجربے میں کیا بنتی ہے؟ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنے وجود کے مختلف النوع تجربات اور متضاد مطالبات کو assimilate کر کے کُل میں ڈھالنے اور اُن سے احساس کا ضابطہ مرتب کرنے کا عمل ہے۔ یعنی یہ دونوں رویں ایک دوسرے کی سمت بڑھتی ہیں لیکن ایک دوسرے کو قطع نہیں کرتیں بلکہ متوازی خطوط کے طور پر ایک دوسرے کی تحدید کرتی ہیں اور ایک دوسرے کا رُخ متعین کرتی ہیں۔ ان دونوں میں اُس تصادم کی نسبت ہے جو نتیجتاً انہدام سے نئی تعمیر کا رُخ واضح کرتا ہے اور نفی سے اثبات کی صورت پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ چناں چہ فن کی سطح پر ان باہم درآویزاں لکیروں سے شاعر کے فکر و عمل یا احساس و شعور کی dichotomy عیاں نہیں ہوتی بلکہ یہ دونوں متضاد عناصر مل کر اپنی کلیت میں ایک بڑی اور زیادہ جامع سچائی کو پیش کرتی ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کو complement کرتی ہیں۔ یہ قطبین کے مابین وسیع و عریض منظر کو اُس کی حدوں کے پھیلاؤ میں دکھاتے ہوئے کشش کے دو الگ الگ مراکز کا سراغ بھی دیتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ کشش کے یہ دونوں مراکز کس قوت سے اپنی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں اور شاعر کا ذہنی وجدان دونوں قوتوں کے مابین کس طور سے توازن حاصل کرتا ہے اور پھر اپنی روحانی شناخت کے لیے ان دونوں میں سے کس کو اپنا مرکزِ ثقل بناتا ہے — اور یہی وہ تجربہ ہے جو ترقی پسند شاعری کے منظر نامے میں افتخار عارف کا نشانِ امتیاز بن جاتا ہے۔

ترقی پسندی کی افادیت پرستی جو ایک حد پر آکر بازاریت میں منقلب ہو جاتی ہے، اس سے اجتناب یا لاتعلقی جو افتخار عارف نے اختیار کی، اس کی طرف اشارہ محض ایک حوالے کی خاطر کیا گیا ہے ورنہ صرف اسی پر موقوف نہیں، افتخار عارف کی تو پوری تخلیقی زندگی بائیں بازو کے نظریہ بازوں سے بالکل ہی الگ وضع کا نمونہ ہے۔ وہ تہذیب کے منافی رویوں کو فروغ دیتے ذرائع ابلاغ سے اُن کی وابستگی کا زمانہ ہو یا بی سی سی آئی اور اردو مرکز لندن سے ربط کا، یہاں مقتدر سیاسی قوتوں سے ان کے ذاتی مراسم ہوں یا پھر اعلیٰ مناصب کا تمکن، افتخار عارف اس پالے کے ہوتے نظر آتے ہیں اور نہ ہی اُس کے۔ اب سوچنے کی بات ہے کہ یہ سارے مراحلِ وجود اور اسرارِ نمود طے کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں وضعِ احتیاط سے دم گھٹنے کی منزلیں بھی تو آئی ہوں گی، تب شاعر پر کیا گزری ہوگی۔ اس ماجرے کا حاصل ہمیں خود افتخار عارف کی شاعری بتاتی ہے کہ کیا ہے:

آشوبِ فراغت! ترے مجرم ترے مجبور
کہہ بھی نہیں سکتے کہ فراغت سے ملا کیا
اک نغمہ کہ خود اپنے ہی آہنگ سے مجوب
اک عمر کے پندارِ ساعت سے ملا کیا
اک نقش کہ خود اپنے ہی رنگوں سے ہراساں
آخر کو شب و روز کی وحشت سے ملا کیا
جیتا ہوا میدان کہ ہاری ہوئی بازی
اس خانہ خرابی کی اذیت سے ملا کیا!

تو ہمارے غور کرنے کا مقام یہی ہے کہ ایک نغمے کی خود اپنے ہی آہنگ سے مجوبی اور ایک نقش کا اپنے ہی رنگوں سے ہراساں ہونا — یہی تو ہے شب و روز کی کاوشِ دُنیا کی پیدا کردہ وحشت کا حاصل اور اک مسلسل خانہ خرابی کی اذیت کا صلہ — لیکن (اور یہ لیکن غور طلب ہے) آشوبِ فراغت کے مجرم اب کس سے کہیں اور کیا کہیں کہ آخر اس فراغت سے انھیں ملا کیا۔ یہاں آکر یہ بات ہم پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ شاعری محض بیان کا

ہنر اور اظہار کا سلیقہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک روح کی پکار ہے، ایک گھائل روح کا احوال جسے دُنیا کی طلب تھی، جس نے دُنیا کے کارزار میں تگ و تاز کی اور وہ پالیا جو اُسے مطلوب تھا — اور جب پالیا تب اُس پر کھلا کہ اِس معرکے میں اُس نے کیسے کیسے کاری وار سہے، کتنے گھاؤ کھائے اور کیا کیا کچھ لٹایا۔ ذرا اچھ[illegible] دیکھیے کہ رائگانی کا احساس کس کس رنگ میں ظاہر ہوتا چلا جاتا ہے:

جس پہ اب تہمتِ شب رنگ کے آوازے ہیں
کتنے سورج تھے کہ اس دامنِ صد چاک میں تھے
جانے کس وادیٔ بے ابر کی قسمت ٹھہرے
ہائے وہ لوگ جو اس موسمِ سفاک میں تھے

———

کہاں کا خیر، کیسی حرمتِ لفظ و معانی
میں دُنیا میں ہوں اور اسبابِ دُنیا چاہتا ہوں

———

ہم وہ مجرم ہیں کہ آسودگیِ جاں کے عوض
رہن رکھ دیتے ہیں دل درہم و دینار کے پاس

اور ملامت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ شاعر یاد کرتا ہے کہ اس کے آبا و اجداد کیسے تھے، اُن کے جو اوصاف تھے اور زندگی گزارنے کا جو طریقہ تھا، وہ اس کے اندر کیوں نہیں آیا۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہاں صرف خود ملامتی کی معنویت ہی غور طلب نہیں ہے بلکہ زندگی کے بدلتے ہوئے چلن اور آدمی کی تبدیل ہوتی ہوئی داخلی ماہیت اسے کیا سے کیا بنا دیتی ہے، یہ ہے وہ سوال جو شاعر کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی سوچنے پر مجبور کرتا ہے:

اور میں پا برہنہ سرِ کوچۂ احتیاج
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی
سوچتا رہ گیا

جسم میں میرے اُن کا لہو ہے تو پھر یہ لہو بولتا کیوں نہیں؟

(ایک سوال)

جو اک نگاہ ڈال لیجے تو افتخار عارف کی شاعری کے پورے منظر نامے پر اس سرے سے اُس حد تک، ''مہرِ دو نیم'' کے کناروں سے چلیے تو ''حرفِ بار یاب'' سے ہوتے ہوئے ''جہانِ معلوم'' کے خطِ مفروش تک صاف دکھائی دیتا ہے کہ اُداسی اور ملال کا گہرا رنگ اور رائگانی کا جاں گسل احساس تیرتا چلا گیا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ زندگی کی کامرانیاں اس آدمی کو سیراب کیوں نہیں کرتیں۔ آسائشوں اور لذتوں کا جو طومار ہے وہ اس شخص کی روح کے خلا کو بھرتا کیوں نہیں ہے۔ کیا یہ خلش، فسردگی، خاطر شکنی اور تنہائی سب کچھ بناوٹی اور آرائشی تو نہیں ہے؟ میری ناچیز رائے میں یہ وہ سب سے ہولناک سوال ہے جس کا سامنا ان لوگوں کو کرنا پڑتا ہے جو افتخار عارف کی شخصیت اور شاعری کو جوڑ کر دیکھتے ہیں یا دیکھنا چاہتے ہیں — بہر حال، میرے پاس اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ اس لیے کہ رنگ در رنگ ملال اور تہ در تہ احساسِ رائگانی اب کچھ ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ کوئی لکھنے والے انھیں اپنے فن کے مکھوٹے پر سجا لے یا پھر مشغلے یا فیشن کے طور پر اختیار کر سکے یا کہیں خارج سے لے کر ان عناصر کو اپنے شعر و نغمہ میں سمو دے۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ اصل میں فن کی مٹی کے ساتھ مسئلہ یہی تو ہے کہ اس میں اجنبی پودے جڑ نہیں پکڑ پاتے۔ یہاں تو بس وہی ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں، ہری ہوتی ہے۔ وہی رَو آواز کے ارتعاش کو ظاہر کرتی ہے جس میں دل کی دھڑکن سما جائے — اور افتخار عارف کے یہاں اس شاخ پر دل کے نہیں دُنیا اور اسبابِ دُنیا کے ثمر آئے ہیں۔ اب دیکھیے کہ ان کا ذائقہ کیسی کڑواہٹ کو ظاہر کرتا ہے:

مات پہ مات دیے جاتی ہے ڈھلتی عمر
دل ڈوبا جاتا ہے بدن ارزانی سے

———

اُس ایک خواب کی حسرت میں جل بجھیں آنکھیں
وہ ایک خواب کہ اب تک نظر نہیں آیا

———

خواب کی طرح بکھر جانے کو جی چاہتا ہے
ایسی تنہائی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

پیمبروں سے زمینیں وفا نہیں کرتیں
ہم ایسے کون خدا تھے کہ اپنے گھر رہتے

اور معاملہ صرف احساس کی کیفیت تک محدود نہیں ہے، شاعر جانتا ہے کہ وہ کس ابتلا کا شکار ہے اور کس تجربے سے دوچار ہے۔ اُسے خبر ہے کہ اُس کے دل و نظر کی دُنیا کیسی ہی پُررونق نظر آئے اور اُس کا ظاہر کتنا ہی آراستہ اور آسودہ کیوں نہ ہو مگر اندر کا حال خراب و خستہ ہے، وہاں تو ویرانیاں آباد ہیں۔ تب وہ سوچتا ہے کہ اس کی جان پر کیا کیا قرض ہیں اور احساس کے اس غلبے کے عالم میں وہ چاہتا ہے کہ جان وار دے:

مجھے اعتراف! مرے وجود پہ ایک چراغ کا ایک خواب کا ایک امید کا قرض ہے
مجھے اعتراف! کہ میرے ناخنِ بے ہنر پہ ہزار طرح کے قرض ہیں
مرا ذہن مجھ کو رہا کرے تو میں سارے قرض اُتار دوں
مری آنکھ مجھ سے وفا کرے تو میں جسم جان پہ وار دوں

(مرا ذہن مجھ کو رہا کرے)

تو اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حسرت و یاس اور حزن و ملال کی جو کیفیت افتخار عارف کی شاعری میں ہے، یہ ہوا کس دریچے سے آرہی ہے؟ یہ ہوا اصل میں دل کے دریچے سے آرہی ہے اور یہ وہی دریچہ ہے جس کی طرف ہم نے سطورِ گزشتہ میں اشارہ کیا ہے۔ تو یہاں ایک سیدھا سادا سا سوال اٹھتا ہے، وہ یہ کہ مادّی معیارات اور زندگی کے مروجہ اسلوب کی رُو سے دیکھا جائے تو افتخار عارف زندگی کو کامیاب بنانے والوں میں شامل ہیں تو پھر اُن کے شعر وسخن میں آخر اس ملال اور رائگانی کے پیدا ہونے کا منطقی جواز کیا ہے؟
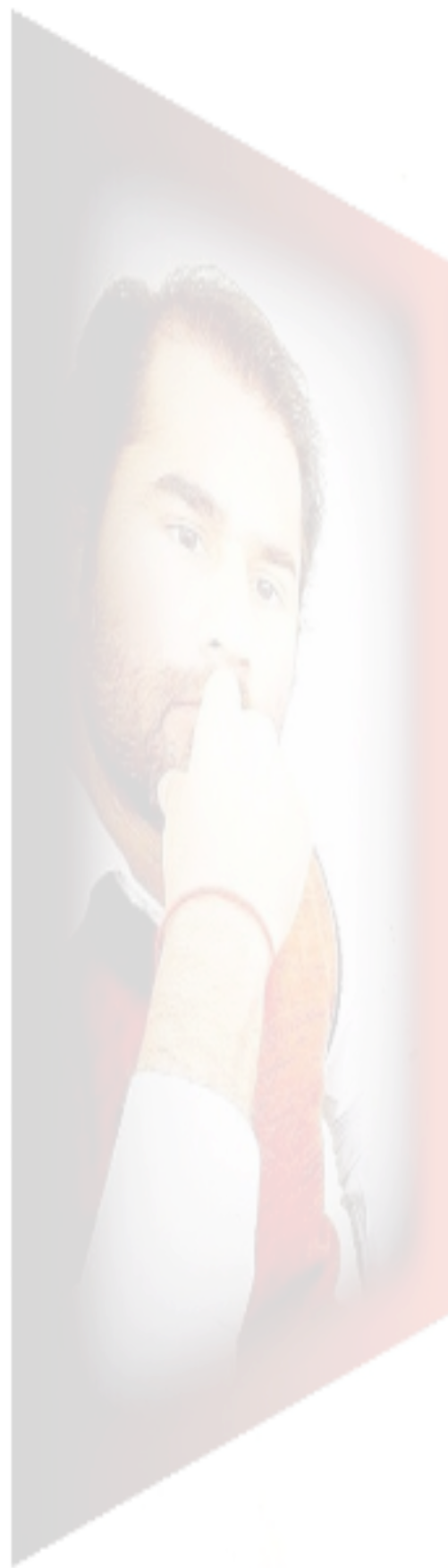
یہاں ہمیں ایک ذرا توقف کرنا ہوگا کہ یہ سوال چاہے کتنا ہی سادہ نظر آرہا ہو اور کیسی ہی سہولت سے کیوں نہ پوچھ لیا گیا ہو لیکن اس کا جواب ذمہ داری اور غور و فکر کے بعد دیا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ سوال ایک تخلیق کار کے مرکزی مسئلے کو سمجھنے کی کلید بن سکتا ہے،

کیوں کہ اُس کے فن، فکر، اسلوب اور اظہار کے پیٹرن اسی مرکزی مسئلے کے تحت طے ہوتے ہیں اور یہی پیٹرن اس کے فن کا معنوی نظام مرتب کرتے ہیں۔ تو ماجرا اصل میں یہ ہے کہ افتخار عارف کے یہاں ملال اور محزونی کا یہ رنگ کسی نوع کی محرومی، ہجر، ناکامی یا پھر نا آسودگی کا پیدا کردہ نہیں ہے، بلکہ یہاں تو یہ کیفیت اس احساس کی زائیدہ ہے جو حاصل کے، وصال کے اور آسودگی کے منتہیٰ کو پہنچنے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ کم ہمتی کا نہیں، ہمت داری کا ماحصل ہے۔ یہ کم مائیگی کا نہیں پُر مائیگی کا محل ہے۔ یہ جستجو اور تگ و دو کی شاد کامی و سرشاری سے آگے کی منزل ہے۔ یہ وجود کے بے ثبات مقامات سے گزر کر روح کے سچے اور دائمی احوال تک پہنچنے کا ماجرا ہے۔ یہ physical reality کا استرداد نہیں ہے، بلکہ پورے شعور کی بیداری کے ساتھ اُس کے اعتراف کے بعد، اس سے آگے اور اس سے بڑے حقائق کے انکشاف و شعور کا مرحلہ ہے۔ جو کچھ پانے کی خواہش تھی، اُسے پالیا تو اُس کی بے وقعتی کا راز افشا ہوا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی محفلوں کے ایک بزرگ امیر حسن علا سجزی نے ایک جگہ لکھا ہے، ''دُنیا کی حقیقت بکری کے بالوں پر پڑی ہوئی گرد سے بھی کم ہے؛ اسے پانے کے بعد اس کا یہ عیب آدمی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہتا۔'' تو اس منزل پر آکر یہ کھلتا ہے کہ آدمی جس کو حقیقت سمجھ رہا تھا وہ تو محض حقیقت کا التباس تھا۔ اب سوچیے اُس آدمی کی بابت جو دُنیا اور آسائشِ دُنیا کو اپنی منزل جانتا ہے اور اس کے حصول کی کوششوں کو حاصلِ عمر گردانتا ہے، اُس پر اپنے التباس کا حال کھلتا ہے تو اس کے احساس کی دُنیا کس طرح تہ و بالا ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ جب اس امر کا ادراک ہو جائے تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ حاصل کا افسوس آدمی کی روح کو گھائل کر کے نہ رکھ دے۔

راس آنے لگی دُنیا تو کہا دل نے کہ جا
اب تجھے درد کی دولت نہیں ملنے والی
ہوسِ لقمۂ تر کھا گئی لہجے کا جلال
اب کسی حرف کو حرمت نہیں ملنے والی

لہو کی آگ میں جل بجھ گئے بدن تو کھلا
رسائی میں بھی خسارہ ہے نارسائی میں بھی
تصادمِ دل و دُنیا میں دل کی ہار کے بعد
حجاب آنے لگا ہے غزل سرائی میں بھی

حوصلوں کا سائباں
راستوں کے درمیاں
کس طرح اُجڑ گیا
کون کب بچھڑ گیا
کوئی پوچھتا نہیں
فصلِ اعتبار میں
آتشِ غبار سے
خیمۂ دُعا جلا
دامنِ وفا جلا
کس بُری طرح جلا
پھر بھی زندگی کا ساتھ ہے کہ چھوٹتا نہیں
کچھ بھی سوجھتا نہیں
کوئی پوچھتا نہیں
اور زندگی کا ساتھ ہے کہ چھوٹتا نہیں

(صحرا میں ایک شام)

نئے نئے منظروں کی خواہش میں اپنے منظر سے کٹ گیا ہوں
نئے نئے دائروں کی گردش میں اپنے محور سے ہٹ گیا ہوں

صلہ، جزا، خوف، نا امیدی
اُمید، امکان، بے یقینی
ہزار خانوں میں بٹ گیا ہوں
(بدشگونی)

گزشتہ سطور میں ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ دُنیا اور علائقِ دُنیا کی طرف افتخار عارف کا رویہ ایک سائل کا جب کہ شاعری میں ان کا رویہ ایک صوفی کا سا ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ صوفی ہیں اور دُنیا اور اس کے حاصلات پر تاسّف کی نگاہ ڈالنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ انھوں نے ایک سالک کے مقامات طے کر لیے ہیں اور وہ شرحِ صدر کے مرحلے سے گزر چکے۔ نہیں، یہ جہاں ہی اور ہے۔ یہ تو راہِ سلوک کی دُنیا ہے۔ افتخار عارف سلوک کے نہیں شعر کے آدمی ہیں اور وہ ہمیشہ اپنی شاعرانہ domain ہی میں رہے ہیں۔ وہ صوفی نہیں بنے، اس لیے کہ صوفی انھیں بننا ہی نہیں تھا یا یہ کہ انھوں نے بننا نہیں چاہا۔ انھوں نے بڑی حقیقتوں کی طرف سفر ضرور کیا لیکن اپنے شاعرانہ credentials کے ساتھ۔ انھوں نے حقیقت کو اپنے درجے میں دریافت کرنے اور بیان کرنے کی سعی کی۔ حلاج بن منصور کا علاقہ اور ہے، رومی، سعدی اور عراقی کا کچھ اور۔ افتخار عارف نہ صرف یہ بات جانتے ہیں بلکہ انھوں نے زندگی اور شاعری دونوں میں اس شعور سے کام بھی لیا ہے۔

اپنے تجربے اور احوالِ جاں کو بیان کرتے ہوئے افتخار عارف نے ایک سلیقے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ ان کے یہاں المیہ احساس glamourize ہوتا ہے نہ اس کے زیرِ اثر ان کی اپنی شخصیت glorify ہوتی ہے اور نہ ہی وہ بیانِ حقیقت کے لمحے میں کسی خود رحمی کا شکار نظر آتے ہیں۔ اُن کے فن کی صلابت یہ ہے کہ وہ اُن کے احساس کو پوری شاعرانہ سچائی اور فن کارانہ سفا کی کے ساتھ ابلاغ کی سطح تک لاتا ہے۔ چنانچہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں وہ کسی آرائش یا تکلف کے بغیر اعترافِ حقیقت اور بیانِ حق کی صورت رکھتا اور معرضِ اظہار میں آ جاتا ہے:

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا

مآلِ عزتِ ساداتِ عشق دیکھ کے ہم
بدل گئے تو بدلنے پہ اتنی حیرت کیا

حامی بھی نہ تھے منکرِ غالب بھی نہیں تھے
ہم اہلِ تذبذب کسی جانب بھی نہیں تھے

آرزوؤں کا ہجوم اور یہ ڈھلتی ہوئی عمر
سانس اُکھڑتی ہے نہ زنجیرِ ہوس ٹوٹتی ہے

آسودہ رہنے کی خواہش مار گئی ورنہ
آگے اور بہت آگے تک جا سکتا تھا میں

لہو میں خاک اڑتی ہے
بدن، خواہش بہ خواہش، ڈھے رہا ہے
اور نفس کی آمد و شد دل کی ناہمواریوں پر بین کرتی ہے
وہ سارے خواب ایک اک کر کے رخصت ہو چکے ہیں جن سے آنکھیں جاگتی تھی
اور اُمیدوں کے روزن شہرِ آئندہ میں کھلتے تھے
بہت آہستہ آہستہ
اندھیرا دل میں، آنکھوں میں، لہو میں، بہتے بہتے جم گیا ہے
وقت جیسے تھم گیا ہے

(کچھ دیر پہلے نیند سے)

کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا ہے کہ افتخار عارف کی ساری شعری کاوش اصل میں پہلے سل کو دل بنانے اور پھر دل ہی کو زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کا عمل ہے۔ یہ ایک طرح کی کیمیا گری ہے۔ دُنیا اور دل میں قطبین کا جو رشتہ ہے اسے انھوں نے کمال فن کاری سے نبھایا ہے۔ اِن دونوں قوتوں کو اپنے سینے کے الگ الگ مقامات پر، ان کی مرکزیت کے احساس

کے ساتھ تھامے رکھنا اور دونوں کی باہمی اور دائمی آویزش سے ایک نئی تخلیقی قوت پیدا کرنا اور اُسے فن کارانہ تصرف میں لانا ہما شما کے بس کی بات نہیں۔ محاورتاً نہیں، حقیقتاً یہ وہ مرحلہ ہے جہاں تخلیق کار خون تھوکنے لگے۔ یہ رومانی شعر گوئی سے تو خیر بالکل ہی مختلف نوعیت کا کام ہے لیکن جدید شاعری نے وہ جو نیم رومانی احساس کے ساتھ اداسی اور حزن و ملال یا پھر نام نہاد بغاوت اور انقلابیت کے آمیزے سے شعر بنانے کا نسخہ ایجاد کیا ہے، معاصر شعری تناظر میں جون ایلیا اور احمد فراز (علی الترتیب) جس کے سب سے اہم نمائندے ہیں، یہ اس سے بہت مختلف کام ہے۔ دیکھیے تصور کتنا ہی دراک کیوں نہ ہو، زندگی کو سوچنا کچھ اور ہے، زندگی کو جینا کچھ اور۔ لہکتے ہوئے مصرعے بلند آواز میں کھینچ کھینچ کر سنانا یا اکھڑے ہوئے لہجے میں شعر پڑھنا، دونوں کا اپنا الگ مزہ ہوتا ہے اور چلیے اپنی اپنی جگہ دونوں کے کچھ معانی بھی نکلتے ہوں گے لیکن شاعرانہ مستی و بے خودی سے حذر کرتے ہوئے پوری ہشیاری اور خود آگاہی کے ساتھ زندگی کو احساس کی اس سطح پر جینا جہاں وہ شعر کی طرح اپنے تہ در تہ معانی منکشف کرتی ہو بالکل ایسا ہی ہے جیسے زہر سے تریاق تیار کرنا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسی تکلف سے کام لینے کی مطلق ضرورت نہیں ہے کہ مادی آسودگی اور وجودی آسائش کے لحاظ سے افتخار عارف نے جس طرز کی زندگی گزاری، شاعرانہ احساس کو اس سے کوئی خلقی مناسبت نہیں ہوتی، بلکہ وہ تو اس کے لیے سمِ قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ ایک رُخ ہے افتخار عارف کو جاننے اور ان کے فن کو سمجھنے کے لیے اور دوسرا رخ یہ ہے کہ کشاکشِ زندگی کا جو بیان اور نفسِ معارفہ کا جو لحن افتخار عارف کی شاعری میں گونجتا ہے، وہ کوئی معمولی درجے کی شے نہیں ہے۔ تضادات سے عملی زندگی میں قوت حاصل کرنا بھی ایک کام ہے — ایک اہم کام، لیکن تضادات کو احساس کے لیے سرچشمۂ قوت بنا لینے کے کیا معنی ہیں، اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مر مر کے جینے کا فن جانتے ہوں۔ افتخار عارف کی شاعری اسی فن سے سروکار رکھتی ہے۔

یار لوگ اس پر گہرے تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ افتخار عارف کی شخصیت کیا ہے اور شعر کس رنگ کا کہتے ہیں وہ، یعنی دونوں میں ایسا واشگاف تضاد ہے کہ جس کی توجیہ محال نظر آئے۔ میں سمجھتا ہوں یہ اعتراض افتخار عارف کو فاصلے سے دیکھنے کی وجہ سے وارد ہوتا ہے۔

اصولی طور پر سب سے پہلے تو ہمیں یہی سمجھ لینا چاہیے کہ اول تو شخصیت اور فن میں ایسا کوئی براہِ راست اور اتنا سادہ تناسب نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ کسی فن کار کی شخصیت اور اس کے فن کو اتنے سادہ اصول سے سمجھنے کی کوشش کرنا بالعموم گمراہ کن ہوا کرتا ہے۔ کسی تخلیق کار کے شخصی رویے جن اصولوں کے تحت متعین ہوتے ہیں، قطعی ضروری نہیں ہے کہ اُس کا فن بھی اُنھی کے تحت قوتِ نمو حاصل کرے، بلکہ ان دونوں میں تخالف اور تضاد کا رشتہ بھی ہوسکتا ہے — اور افتخار عارف کے یہاں یہی تضاد کا رشتہ کارفرما ہے۔ یہ تضاد معمولی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ بے حد شدید قسم کا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اسی تضاد کی شدت نے افتخار عارف کے فن کو اصل قوت عطا کی ہے۔ اگر اُن کی سماجی شخصیت اور تخلیقی شخصیت کے مابین شدید تضاد و تخالف کا یہ رشتہ نہ ہوتا اور احساس کے ان دونوں مراکز کے درمیان یوں طنابیں کھنچی ہوئی نہ ہوتیں تو اُن کے شعر میں یہ تناؤ اور توانائی پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ اصل میں اُن کی سماجی شخصیت کو اُن کا تخلیقی شعور جس شدت سے رد کرتا ہے وہی شدت منقلب ہوکر ان کے فن کی قوت بن جاتی ہے۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ افتخار عارف کی ذات تہذیبی شخصیت، سماجی شخصیت اور تخلیقی شخصیت کا مجموعہ ہے۔ ان کی شخصیت کے یہ تینوں پہلو اپنی اپنی جگہ خود مکتفی ہیں اور اپنے اپنے مقام پر بروئے کار آتے ہیں۔ ان پہلوؤں کے بعض عناصر ایک دوسرے کی ضد پر قائم ہیں۔ افتخار عارف کی سماجی شخصیت ان ضدین کو نہ صرف یہ کہ توڑنے اور تحلیل کرنے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس وہ پوری ذمہ داری اور شعور کے ساتھ انھیں قائم رکھتی اور استعمال کرتی ہے۔ جب کہ تخلیقی شخصیت تضادات کے ان دائروں کو توڑتی ہوئی اُس مرکز تک جا پہنچتی ہے جہاں یہ تینوں صفات اپنے جوہر میں ایک ہوجاتی ہیں اور اپنی اصل کو پالیتی ہیں۔ یہاں کوئی امتیازی نشان باقی رہتا ہے اور نہ ہی فرقِ مراتب۔ یہاں جو کچھ ہے وہ جامعیت یا کلّیت میں ہے۔ سارے رنگ آپس میں مل کر ایک رنگ میں ڈھل جاتے ہیں۔ سب چہرے ایک چہرے میں مدغم ہوجاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا اور یہ جاننے میں کوئی دلچسپی بھی نہیں رکھتا کہ افتخار عارف نے اپنی اخلاقی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں کتنے فی صد سچ سے کام لیا ہے لیکن میں نے یہ ضرور جان لیا ہے کہ اُن کے شعروسخن میں نطقِ بے ریا بروئے کار آیا ہے — اور یہ بہت مشکل کام

ہے، بے حد مشکل۔ اپنے وجود و شہود کی ناسپاس حقیقتوں کا سامنا کرنے کی جرأت بہم پہنچانے کی وجہ سے ہی تو شاعر کو تلمیذ الرحمٰن اور شاعری کو جزویست از پیغمبری کہا جاتا ہے۔ کچھ شعر تو آپ اس مضمون میں پہلے پڑھ چکے ہیں، کچھ اور دیکھیے اور غور کیجیے کہ افتخار عارف نے اعترافِ حقیقت اور اظہارِ احوال میں شخصیت کے کن کن رنگوں کو سامنے رکھا ہے اور کس کس پیرایے میں اپنے جذبہ و احساس کی اس کیفیت کو گرفت کیا ہے:

یہ رَجز خواں — ہنرِ کاسہ و کشکول میں طاق
اپنی بنیاد میں پروردۂ سرمایہ نہ ہو
پسِ پردہ، یہ مزاحم، متصادم لہجہ
نہیں اظہارِ اطاعت ہی کا پیرایہ نہ ہو

———

زمانہ کیسی کیسی زندہ آوازوں سے روشن ہے
مگر ہم ہیں کہ بس اپنی صدا اچھی لگی ہم کو

———

وہی ہے وحشتِ ظلمات و ظلمت
نشانِ آگہی بے نور اندیشوں کی زد میں ہے
شمارِ منزلِ تجدید بابِ مسترد میں ہے
بنامِ انجم و مہتاب اک غولِ بیابانی نے
ایسی خاک اُڑائی ہے کہ سارا مطلعِ خیر و خبر دُھندلا رہا ہے
کہاں کی حرمتِ اقدار و افکار
وجودِ خیر پر حرف آ رہا ہے
غبارِ بے نہایت کا سماں ہے
''خداوندا! تری نصرت کہاں ہے؟''

(نَصرٌ مِّنَ اللہ...!)

اور صرف اسی احساس کی رو تک حرف حق موقوف نہیں ہے بلکہ اس سے آگے بھی ایک منزل ہے جہاں آدمی تاسف، ملامت اور احساس ندامت کی تیکھی کیفیت میں سوچتا ہے:

ہمیں میں رہتے ہیں وہ لوگ بھی کہ جن کے سبب
زمیں بلند ہوئی آسماں کے ہوتے ہوئے

یوں تو بار بار ہم دیکھتے ہیں کہ تناؤ، تضاد، تخالف اور تردید کے یہ سارے حوالے افتخار عارف نے محض اپنی ذات کو ہدف بنا کر اپنے شعر و سخن میں اجاگر کیے ہیں لیکن کیا ہمیں صرف یہ کہہ کر مطمئن ہو جانا چاہیے کہ افتخار عارف نے شعری پیرایے میں تواتر سے اپنے لیے حرف ملامت لکھا ہے اور یہ کہ اُن کی شاعری کا ایک رنگ یہ بھی ہے۔ نہیں، محض اتنا کہہ کر ہر فکر سے آزاد ہو جانا تفہیم سخن کے مطالبے کو پورا نہیں کر سکتا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ شاعری عمل کا نہیں خیال کا میدان ہے، یہ ذہن کی دُنیا ہے۔ اس کی حقیقتیں ہماری دُنیا کی tengible حقیقتوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ ان دونوں دُنیاؤں کی حقیقتیں تمام تر بُعد کے باوجود co-exist کر سکتی ہیں بلکہ کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ جو شاعری کا افتخار عارف ہے وہ عملی زندگی کے افتخار عارف کے ساتھ جیتا ہے۔ ان میں سے ایک دُنیا دار ہے تو دوسرا دُنیا کی حقیقت سے باخبر ہے اور اُسے تیج جانتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی دوسرے کو پچھاڑنے پر تُلا ہوا نظر نہیں آتا۔

ہمارے یہاں کچھ عرصے پہلے تک ملامتی صوفی بنانے کا فیشن چل رہا تھا۔ خلطِ مبحث کے بھی کیا کیا لطیفے ہمارے یہاں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ہمیں افتخار عارف کو سلسلۂ ملامتیہ کا صوفی نہیں بنانا چاہیے۔ اس لیے کہ صوفی یا تو اپنے قول و فعل اور خیال و عمل میں پورا صوفی ہوتا ہے یا پھر نہیں ہوتا۔ افتخار عارف صوفی نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہزیمت و ملامت ایک باشعور فن کار کی حیثیت سے قبول کی ہے — اور اس میں چاہے تمام تر کنایہ خود افتخار عارف کی ذات ہی کا کیوں نہ ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ملامت میں ہماری تہذیبی و مذہبی اور سیاسی و سماجی تاریخ کے وہ حوالے در آئے ہیں کہ یہ ملامت محض افتخار عارف کی ذات سے مخصوص نہیں رہتی بلکہ ایک prototype کو اپنا ہدف بنا لیتی ہے۔ یوں ایک شخص سے آگے پوری ایک تہذیبی تاریخ کا منظر نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ ہے افتخار عارف کا وہ

شعری ہنر کہ جس کی بنیاد پر وہ معاصر شعری تناظر میں اپنی انفرادی شناخت کا مرحلہ سر کرتے ہیں — اور ایک ایسے شاعر کے طور پر اُبھرتے ہیں جس نے اپنی ذات سے تاریخ تک کے تاریک حوالوں سے اپنا اثبات کیا ہے۔ یہ تیج اپنے وجودی اور فکری تجربے کا جرأت کے ساتھ سامنا کرنے پر حاصل ہوتا ہے۔

افتخار عارف ان معنوں میں خوش قسمت آدمی ہیں کہ صرف زندگی ہی ان پر مہربان نہیں رہی بلکہ اُن کے شعر و سخن نے بھی خوب داد سمیٹی ہے۔ ان کے پڑھنے اور چاہنے والوں کا حلقہ صرف ہندوستان پاکستان میں نہیں ہے، بلکہ برطانیہ سے کینیڈا اور امریکا تک انھیں شعری داد دینے والے پائے جاتے ہیں۔ تاہم ایسے تخلیق کاروں کو ایک مسئلہ بھی پیش آتا ہے جو افتخار عارف کو بھی پیش آیا ہے، وہ یہ کہ ایسے لوگوں کے کام کو سراسر بیان کا ہنر اور محض اظہار کا فن سمجھ لیا جاتا ہے۔ اُن کا سخن اکثریت کے لیے فن کا پردہ بن جاتا ہے اور وہ شعر کے تار و پود میں سمائی ہوئی گھائل روح اور اُس کے آہنگ میں شامل مضطرب دل کی دھڑکن کو سننے سے قاصر رہتے ہیں۔ میرے اس بیان کی تصدیق افتخار عارف کی شاعری پر لکھے گئے بیشتر مضامین میں اُٹھائے گئے نکات اور شاعر کو دی گئی داد سے بالصراحت ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ داد بے محل یا بے معنی ہے۔ نہیں، وہ بھی ٹھیک ہے لیکن بات اصل میں یہ ہے کہ یہاں قشر اور مغز کا فرق ہے۔ افتخار عارف کے شعر کی یہ داد کہ انھوں نے دوسروں سے ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالی، اِن کے مضامین میں انفرادیت ہے یا یہ کہ اُن کا لہجہ جس شائستگی کا حامل اور آواز جس کیف و کم سے مملو ہے، اس کی اپنی ایک شان ہے۔ یہ ساری باتیں ٹھیک تو بے شک ہیں، لیکن ہیں محض رسمی نوعیت کی باتیں اور ان کے شعر کو سراسر اُس کی اوپری سطح پر ہی دیکھ کر کہی گئی ہیں، اس کی تہ میں اُترنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعری کی اصل داد یہ ہے کہ اس نے افتخار عارف کی وجودی حیات کے لیے سیفٹی والوو کا کام کیا ہے۔ اس شاعری نے ہی تو افتخار عارف کو جھیلا اور انھیں زندگی جھیلنے میں مدد دی، ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ کسی سرکاری درباری کی طرح غیر انسانی حدوں کو پہنچی ہوئی منافقت اور اُس کے تحت لایعنیت کے درجے میں محض وجودی زندگی گزار رہے ہوتے یا پھر ہمت کے فقدان کے کسی شدید لمحے میں

زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتے۔۔ اور یہ جو بات میں نے کہی ہے یہ کچھ ایسی بعید از قیاس نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایسی مثالیں بھی ہمارے مشاہدے میں ہیں کہ جن کے لیے شاعری سیفٹی والو نہ بن سکی تو وہ زندگی کو سہار نہ پائے اور جان سے گزر گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ افتخار عارف کے یہاں شاعری سیفٹی والو کیسے بنی؟ دیکھیے ان کے یہاں دین کا حوالہ اور کربلا کا استعارہ ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پہلو کی طرف اُن کے اکثر نقاد اشارہ بھی کرتے آئے ہیں اور اسے ان کی عقیدت سے موسوم کیا گیا ہے۔ درست، یہ عقیدت کا معاملہ تو ہے ہی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ افتخار عارف کے شعری نظام میں اس عقیدت کے معنی کیا ہیں؟ اس لیے کہ ادب کے تناظر میں محض عقیدت تو کوئی ایسی شے نہیں ہوتی کہ اُسے کسی شاعر کے فن کا امتیاز قرار دیا جائے۔ علاوہ ازیں یہ عقیدتی پہلو افتخار عارف کے یہاں صرف نعت، سلام، منقبت یا نوحے تک موقوف نہیں بلکہ ان کے یہاں تو غزل اور نظم میں بھی یہ موضوع نظر آتا ہے — نہ صرف نظر آتا ہے بلکہ ان اصناف کے اپنے فنی تقاضوں اور انھی کے مخصوص اسالیب میں۔ مراد یہ ہے کہ خالص غزلیہ آہنگ یا شاعرانہ پیرایے میں بھی اُن کے یہاں بیانیہ کا وہ رنگ جھلک جاتا ہے جس میں مذہبی تلازمات گونجتے ہیں۔ خاطر نشان رہے یہاں مذہبی حوالے، یا شخصیات کا ذکر صرف اور صرف تشبیہ، استعارے یا تلمیح کی صنعت سے شاعر کے شغف کی طرف اشارہ نہیں کرتا بلکہ یہ تو سوچ کے ایک رویے، زندگی کے ایک رُخ، اور جہتِ انسانی کی جداگانہ کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:

بطرزِ مختلف اک نعت لکھنا چاہتا ہوں
میں ساری نعمتیں اک ساتھ لکھنا چاہتا ہوں
مرا معبود خود توفیق ارزانی کرے گا
میں وصفِ سرِّ موجودات لکھنا چاہتا ہوں

میں کچھ کریموں کے بابِ نعمت سے منسلک ہوں
سو میں جہاں بھی رہوں گا مجھ پر کرم کریں گے

ترکش و تیغ نہ پیکان و سناں دیکھتا ہے
حرفِ حق جانبِ صاحب نظراں دیکھتا ہے

صف آرائی ہوئی تھی جب میانِ ظلمت و نور
بڑے تیور سے تیغِ تیز کا جوہر کھلا تھا

خلیلِ آتش نشیں کی میراث کا تسلسل نگاہ میں ہے
سو امتحاں سے گزرنے والوں پہ حرفِ صد آفریں لکھیں گے

ان مثالوں سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ افتخار عارف نے ان حوالوں اور استعاروں کو مذہبی رنگ یا عقیدے کے جذبے کے تحت ہی نہیں برتا ہے، یہ ان کے فکری نظام اور شعری اسلوب میں مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہاں اس امر کی نشاندہی بے جا نہ ہوگی کہ افتخار عارف کے شعر کی یہ کوئی ایسی جہت نہیں ہے کہ جو شاعر کی ذہنی پختگی کے سفر میں آگے چل کر کسی مقام پر نمایاں ہوئی ہو۔ نہیں، یہ تو ان کے یہاں ابتدا ہی سے موجود ہے، یعنی ''مہرِ دو نیم'' سے ہی ہم اس جہت کو افتخار عارف کی شاعری میں دیکھ سکتے ہیں۔ تو فی الواقعہ یہ وہ شے ہے جو اُن کی شاعری کو اُن کے لیے سیفٹی والو یا زندگی کا راستہ بنا دیتی ہے۔ اصل میں تمام تر روشن خیالی، ترقی پسندی اور جدیدیت کے باوصف افتخار عارف کا ذہنی سانچا مذہبی اقدار اور مشرقی تہذیب کا اثبات کرتا ہے۔ یہ ذہنی سانچا اس نوع کا ہے کہ یہاں مذہبی اقدار محض عقیدت یا خیال کی سطح پر ہی معنویت کی حامل نہیں ہیں، بلکہ اُن کی حیثیت روشنی کے ایک دائمی مبدا کی ہے۔ یہ روشنی افتخار عارف کے فکری نظام اور شعری اسلوب دونوں کو منور کرتی ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان حوالوں اور نسبتوں کے باعث افتخار عارف کے یہاں crude سے sublime کی طرف اور حقیقت کے ادنیٰ سے اعلیٰ درجے کی جانب جستجو کا ایک عمل ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن فکر و جستجو کا یہ پورا عمل صرف روحانی عقیدت اور مذہبی نسبت پر منحصر نہیں ہے، بلکہ واقعہ یوں ہے کہ یہ عمل ایک طرف زندگی کے تضادات کی تنقیح کرتا ہے اور

شاعرکو اپنی تمام تر انسانی کمزوریوں اور شخصی خامیوں کا شعور عطا کرتا ہے۔ یہی وہ حوالہ ہے جو زندگی کی کامرانیوں کے نشے میں افتخار عارف کو غرق ہونے سے بچالے جاتا ہے — اور دوسری طرف یہ اُن کے یہاں انسانی سرشت کا ادراک پیدا کرتا ہے اور جینے کے معنی اُجاگر کرتا ہے۔ یوں زندگی لائقِ اعتنا ہوجاتی ہے۔تو اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ شاعری کس طرح افتخار عارف کے لیے سیفٹی والوو کا کام کرتی ہے۔

افتخار عارف کی شاعری میں وہ جو ایک حزن، اُداسی، بے مائگی اور تنہائی کا احساس پیدا ہوا ہے وہ رومانی جذبے سے لے کر وجودی تجربات سے ہوتا ہوا روحانی احساسات تک پہنچتا ہے تو اس کا سبب دراصل مذہبی اقدار سے افتخار عارف کی یہی وابستگی ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ حقائق کی یہ آگہی اور احساس کی رفعت ان کے فکرونظر کا دائرہ مکمل کرتی ہے — اور اس مرحلے پر آ کر شاعری صرف کرافٹ نہیں رہتی، صناعی یا کاریگری نہیں رہتی بلکہ طرزِ زیست بن جاتی ہے۔ وہ طرزِ زیست جو دماغ اور دل دونوں منطقوں تک رسائی پاتی ہے، اُن پر اپنی معنویت کا نقش چھوڑتی ہے اور دل و دُنیا کے بیچ بٹے ہوئے آدمی کو بیک وقت ہار اور جیت کے روحانی اور وجودی احساس کے ساتھ زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

مُبین مرزا
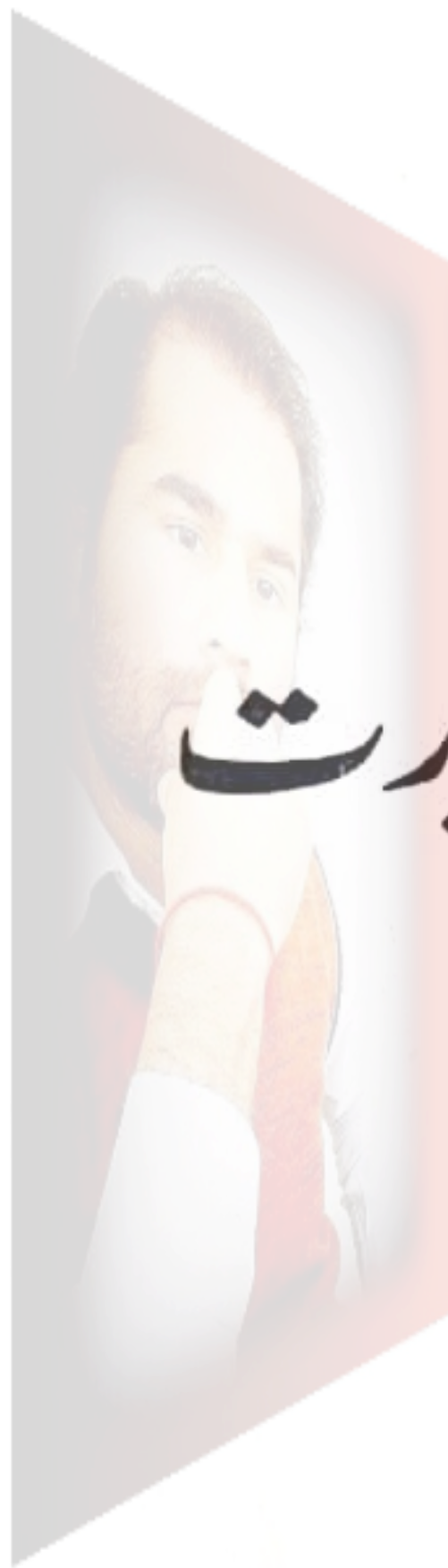
باب عقیدت

پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

افتخار عارف کی نعت

افتخار عارف نے اپنے حافظے اور علم و معلومات کے ذریعے اپنا تعارف کرایا اور پھر غزل کے اس دور میں اس کی غزل گوئی نے ناقدوں میں اپنی جگہ بنائی۔ اُس کے اس شعر کو ضرب المثل کا درجہ حاصل ہوا:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس کو گھر کر دے

اُس کی یہ دُعا بارگاہِ ایزدی میں جس طرح قبول ہوئی اس کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں ہوگا۔ وہ کسی مکان، کسی نگر اور کسی دیار میں رہے، اللہ پاک نے مدینہ منورہ کو اس کی حقیقی شخصیت کا گھر بنا دیا ہے اور جب اس کے رب نے اسے یہ دولت عطا کر دی تو اسے خبر ہوئی اور بے اختیار دل سے آواز اُبھری:

عمر بھر ٹھوکریں کھاتا نہ پھروں شہر بہ شہر
ایک ہی شہر میں اور ایک ہی در پر رکھا

اور اس شہر میں اسے مدحتِ شافعِ محشر ﷺ پر مقرر کیا گیا۔ آدمی کو چاکری ملے تو ایسی کہ شہنشاہ بھی رشک کریں۔

شعر کے بارے میں کئی نظریات، تصورات اور خیالات ہیں۔ مجھے ان میں تضاد نظر نہیں آتا بلکہ یہ ایک دوسرے کا تکملہ معلوم ہوتے ہیں۔ شاعری کی ایک ادا بے ساختہ پن ہے اور ایک شیوہ آراستگی ہے۔ شاعری سادگی بھی ہے اور مرصع ساز کا کام بھی۔ افتخار عارف کی

شاعری اور بالخصوص نعت میں بہارے رنگ موجود ہیں۔ بحریں ایسی کہ ان میں نغمگی لفظ بہ لفظ آگے بڑھتی ہے اور مصرع ختم کرنے کے بعد اس کی لہریں ذہن میں پھیلتی جاتی ہیں۔ لفظ ایسے جیسے عقیدت اور محبت مقامِ محمدی ﷺ کے باب میں سوچ رہے ہوں۔ فکر اور جذبے کا ایسا امتزاج آج کے کم ہی نعت گو شاعروں کے ہاں نظر آئے گا۔ افتخار عارف کی ان نعتوں میں سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ کی از ازل تا ابد وقت پر حاوی شخصیت اور رسالت کے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اہلِ بیت اور محبانِ اہلِ بیت کی محبت کی شادابی بھی ہے۔

بعض لوگ جو کٹر مذہبی دکھائی دیتے ہیں، اندر سے دنیا دار نکلتے ہیں اور بعض نظر بظاہر دنیا میں ڈوبے ہوئے لوگ حقیقی مذہبیت سے مالا مال ہوتے ہیں کہ ایسی مذہبیت حبِ رسول ﷺ سے عبارت ہوتی ہے۔

افتخار عارف کی نعتوں کے مطالعے سے میری بات آپ پر واضح ہو سکے گی۔

○

پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
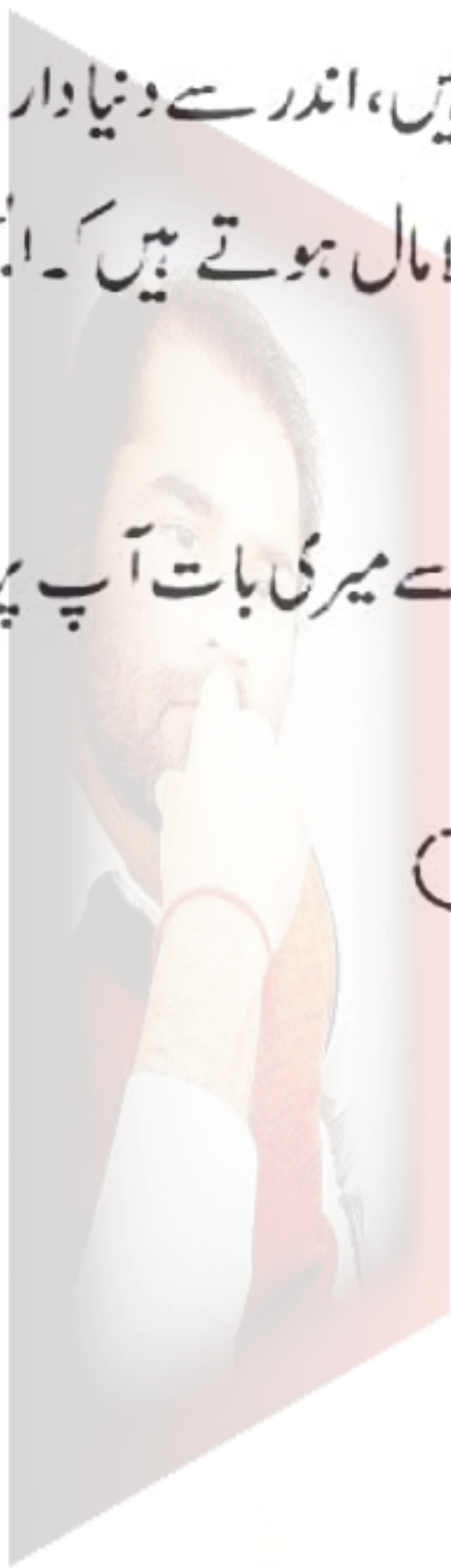
سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ ☆

اب ہم اس شاعر کا ذکر کریں گے جس کے یہاں یہ رجحان ایسی محویت اور تخلیقی شان سے اظہار پذیر ہوا ہے کہ اس کے شعری شناخت نامے کا ناگزیر حصہ بن گیا ہے، ہماری مراد افتخار عارف سے ہے۔ افتخار عارف کے بارے میں، میں اپنے مضمون میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ واقعۂ کربلا اور اس کے تعلیقات کا نئے سماجی انسانی مفاہیم میں استعمال یوں تو اوروں کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن افتخار عارف کے تخلیقی وجدان کو اس سے جو گہری مناسبت ہے، اس کی نئی شاعری میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ افتخار عارف کے یہاں یہ بات اُن کے تخلیقی عمل کے بنیادی محرک کا درجہ رکھتی ہے کہ وہ لمحۂ موجود کی پیچیدہ سیاسی، سماجی، اخلاقی اور انسانی صورتِ حال کو ایک وسیع تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک ایسے مرکزی کردار کا تصور ملتا ہے جو مسلسل ہجرت میں ہے، عذابوں میں گھرا ہوا ہے، دربدر خاک بسر مارا مارا پھر رہا ہے، اور کوئی دارالاماں اور جائے پناہ نہیں۔ ان کے یہاں بنیادی تاریخی حوالے سے جو پیکر اُبھرتے ہیں، مثلاً پیاس، دشت، گھرانا، گھمسان کا رَن، بستی، بیاباں، قافلۂ بے سروساماں، یہ سب ثقافتی روایت کے تاریخی نشانات بھی ہیں اور آج کے عذابوں میں گھری ہوئی زندگی کے کوائف وظواہر بھی۔ ان کا شعری وجدان کچھ اس نوع کا ہے کہ اُن کے اشعار صدیوں کے درد کا

☆ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اسی نام کی کتاب سے اقتباس۔

منظر نامہ بن جاتے ہیں اور ان میں وہ لطف و تاثیر بھی پیدا ہو جاتی ہے جسے خداداد کہا گیا ہے:

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رَن پڑنا ہے اور گھمسان کا رَن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے
ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک اُمید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے
دریا پر قبضہ تھا جس کا اس کی پیاس عذاب
جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے

بستی بھی سمندر بھی بیاباں بھی مرا ہے
آنکھیں بھی مری خوابِ پریشاں بھی مرا ہے
جو ڈوبتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری
جو ٹوٹتا جاتا ہے وہ پیماں بھی مرا ہے
جو ہاتھ اُٹھے تھے، وہ سبھی ہاتھ تھے میرے
جو چاک ہوا ہے وہ گریباں بھی مرا ہے
جس کی کوئی آواز نہ پہچان نہ منزل
وہ قافلۂ بے سروساماں بھی مرا ہے
ویرانۂ مقتل پہ حجاب آیا تو اس بار
خود چیخ پڑا میں کہ یہ عنواں بھی مرا ہے
وارفتگیِ صبحِ بشارت کو خبر کیا
اندیشۂ صد شامِ غریباں بھی مرا ہے

میں وارثِ گل ہوں کہ نہیں ہوں مگر اے جان!
خمیازۂ توہینِ بہاراں بھی مرا ہے
مٹی کی گواہی سے بڑی دِل کی گواہی!
یوں ہو تو یہ زنجیر، یہ زنداں بھی مرا ہے

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوکِ سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
پتھر پہ سر رکھ کر سونے والے دیکھے
ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
شاخِ بریدہ کھلی فضا سے پوچھ رہی ہے
کوئی شکستہ پر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
خاک اُڑانے والے لوگوں کی بستی میں
کوئی صورت گر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
سچے سائیں ہمارے حضرت مہر علی شاہؒ
بابا! ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ افتخار عارف کے یہاں بنیادی تاریخی حوالے سے فیضان حاصل کرنے اور اس سے گونا گوں شعری کیفیات اُبھارنے کا ان کا شعری پیرایہ شدید انفرادیت رکھتا ہے۔ پیاس، دشت، گھرانا، رن پڑنا، ایک کتاب اور ایک اُمید کا اثاثہ، ڈھالیں، شام، مسافر، چاک گریباں، قافلۂ بے سروساماں، شامِ غریباں، خنجر، خیمہ، لشکر، نوکِ سناں، سیاہِ شام، نیزے پہ آفتاب کا سر، یہ سب سامنے کے تعلیقات ہیں لیکن ان کی حیثیت محض الفاظ کی نہیں، یہ وقت کی محض ایک سطح پر کسی ایک حقیقت کو ظاہر نہیں کرتے، بلکہ افتخار عارف کا شعری وجدان موجود صورتِ حال کی سفا کی کے بیان میں ان سے نئی نئی معنیاتی جہات پیدا کرتا ہے۔ غور فرمایئے کہ ''وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے'' میں جہاں ضمیر ''وہی'' کی تکرار

اور " ہے " حالیہ صیغہ نے جو ردیف کا حصہ ہے، ان اشعار کو لمحۂ موجود سے جوڑ دیا ہے، وہاں پیاس، دشت، گھرانا، مشکیزہ وغیرہ علائم اس سانحۂ عظیم کی یاد تازہ کرتے ہیں جس نے حق وصداقت کے تحفظ کی خاطر خون کی گواہی سے انسانیت کو صدیوں سے سیراب رکھا ہے۔ دوسری غزل بھی بے پناہ ہے۔ بس بھی سمندر بھی بیاباں بھی مرا ہے/ یار جو ڈوبتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری/ یار جو ٹوٹتا جاتا ہے وہ پیاں بھی مرا ہے/ میں کس کی آواز ہے۔ یار جو ہاتھ اُٹھے تھے وہ سبھی ہاتھ تھے میرے/ یہ کس کے ہاتھ تھے، یہ کون کہہ رہا ہے کہ جس کی کوئی آواز نہ پہچان نہ منزل، وہ قافلۂ بے سروساماں بھی مرا ہے۔ یہاں مرا اور مرے کی ضمیر سے درد کی مقدس روایت سے ایک ازلی وابدی رشتہ قائم ہوگیا ہے۔ اور یہ احساس پورے شعری وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ درد افتخار عارف کے لہجے کی خاص پہچان ہے۔ تیسری غزل/خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے/نہیں ردیف "بہت دنوں سے" واضح طور پر اشارہ کر رہی ہے کہ ظلم وتعدی کے خلاف حق کوشی کی جدوجہد حیاتِ انسانی کا وظیفہ ہے جس کی انسان کو آج شدید ضرورت ہے۔ اس غزل میں نوکِ سناں پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے، کے علاوہ کہیں کوئی واضح تاریخی پیکر نہیں، لیکن پوری غزل درد کے احساس میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ کمال تاریخی تعلیقات کے استعاراتی وعلامتی استعمال کا ہے۔ یہ استعمال جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، دوسروں کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن غزل میں جس بڑے پیمانے پر اس کی کارفرمائی افتخار عارف کے یہاں ہے، وہ انھی کا حصہ ہے۔ استعاراتی اظہار کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر اسے تخلیقی رچاؤ اور گہرے احساس سے برتا جائے تو اس کے امکانات لامحدود ہوجاتے ہیں۔ اس کے گوناگوں مفاہیم کا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ معلوم ہے کہ استعارہ قطعیت کی ضد ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز ٹھوس حقیقت ہی ہے، لیکن سچی شعری کارفرمائی کے بعد معنیاتی امکانات کی اتنی جہات پیدا ہوجاتی ہیں کہ ان کا قطعی بیان ممکن نہیں۔ اس نوع کے معنیاتی امکانات کا وضاحت کی گرفت میں نہ لاسکنا معنیات کا قدیمی مسئلہ ہے اور اسی غیر قطعیت میں شعری اظہار کے کیف واثر یعنی حسن کاری کا راز پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے۔ استعاراتی اور علامتی پیرائے کا بس شعری اظہار ہی ممکن ہے۔ رہے اس کے روشن اور دُھندلے خطے، تو ان سے

کسبِ فیض کرنا اور لطف اندوز ہونا قاری کے ذوق و ظرف پر منحصر ہے (نقاد کی حیثیت بھی باخبر، باذوق، تربیت یافتہ قاری کی ہوتی ہے)۔ یہاں یہ اشارہ بھی ضروری ہے کہ قطعی تاریخی معلومات اور تخلیقی سطح پر کارفرما ہونے والے تاریخی احساس میں نازک سا فرق ہے۔ قطعی تاریخی معلومات شعور کا حصہ ہیں، لیکن جب یہ شعری احساس میں ڈھلتی ہیں تو ذہن و شعور کی تمام سطحیں یعنی تحت الشعور اور لاشعور بھی کارفرما ہوتے ہیں اور یہ پوری سائیکی اور پورے تخلیقی وجود کا حصہ بن جاتی ہیں۔ چنانچہ کھرے شعری احساس میں ان کا دائرۂ عمل اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ تمام کیفیتوں کا تعین ممکن نہیں رہتا:

کہیں سے کوئی حرفِ معتبر شاید نہ آئے
مسافر لوٹ کر اب اپنے گھر شاید نہ آئے
کسے معلوم اہلِ ہجر پر ایسے بھی دن آئیں
قیامت سر سے گزرے اور خبر شاید نہ آئے

سیاہ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگارِ شب نکلا!

ہر اک سے پوچھتے پھرتے ہیں تیرے خانہ بدوش
عذابِ دربدری کس کے گھر میں رکھا جائے

وفا کے باب میں کارِ سخن تمام ہوا
مری زمین پہ اک معرکہ لہو کا بھی ہو

یہ اب کھلا کہ کوئی بھی منظر مرا نہ تھا
میں جس میں رہ رہا تھا وہی گھر مرا نہ تھا

میں جس کو ایک عمر سنبھالے پھرا کیا
مٹی بتا رہی ہے وہ پیکر مرا نہ تھا

موجِ ہوائے شہرِ مقدر جواب دے
دریا مرے نہ تھے کہ سمندر مرا نہ تھا

سب لوگ اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ تھے
اک میں ہی تھا کہ کوئی بھی لشکر مرا نہ تھا

افتخار عارف کے یہاں، شہر کے پیکر کو بھی مرکزیت حاصل ہے۔ یہ بستی جانی پہچانی بہت ہے — تمام شہر مکرم، بس ایک مجرم میں — کوئی تو شہرِ تذبذب کے ساتھیوں سے کہے — یا، مدحِ قاتل میں مقالے بھی ترے شہر سے آئیں — یا، خیمۂ عافیت کی طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقتِ شہر — یہ کیسا شہر ہے؟ اس کی خلقت کیسی خلقت ہے، یہ کس عذاب میں گرفتار ہے اور کیوں گرفتار ہے؟ اوپر منیر نیازی کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے ذکر آیا تھا کہ یہ اُردو کی تخلیقی اور ثقافتی روایت کے اجتماعی لاشعور میں بسا ہوا کوئی قدیم نشان ہے، کوفہ، دمشق، یا تیزی سے گزرتے ہوئے آج کا کوئی شہر یا بستی یا ایسا معاشرہ، جو منافقتوں میں گھر گیا ہے، عذابوں میں گرفتار ہے۔ ان کے اشعار کو دیکھیے:

عذابِ وحشتِ جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی
نئے سفر کے لیے راستہ نہ مانگے کوئی

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دُعا نہ مانگے کوئی

تمام شہر مکرم بس ایک مجرم میں
سو میرے بعد مرا خوں بہا نہ مانگے کوئی

کوئی تو شہرِ تذبذب کے ساکنوں سے کہے
نہ ہو یقین تو پھر معجزہ نہ مانگے کوئی

حبسِ شب ہو تو اُجالے بھی ترے شہر سے آئیں

خواب دیکھوں تو حوالے بھی ترے شہر سے آئیں
تیرے ہی شہر میں سر تن سے جدا ہو جائے
خوں بہا مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں
بات تو جب ہے کہ اے گریہ کنِ حرمتِ حرف
مدحِ قاتل میں مقالے بھی ترے شہر سے آئیں

یہ بستی جانی پہچانی بہت ہے
یہاں وعدوں کی ارزانی بہت ہے
شگفتہ لفظ لکھے جا رہے ہیں
مگر لہجوں میں ویرانی بہت ہے
ہے بازاروں میں پانی سر سے اونچا
مرے گھر میں بھی طغیانی بہت ہے

کسی کے جور و ستم یاد بھی نہیں کرتا
عجیب شہر ہے فریاد بھی نہیں کرتا

کس قیامت خیز چپ کا زہر سناٹے میں ہے
میں جو چیخا ہوں تو سارا شہر سناٹے میں ہے
ایک اک کر کے ستارے ڈوبتے جاتے ہیں کیوں
جاگتی راتوں کا پچھلا پہر سناٹے میں ہے
دیدنی ہے وحشتِ اولادِ آدم ان دنوں
آسمانوں پر خدا کا قہر سناٹے میں ہے

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے
کاروبارِ جنوں عام تو ہے مگر اک ذرا مختلف ہے

آج کی رات ننھی سی لو بھی اگر بچ رہے تو غنیمت
اے چراغِ سرِ کوچۂ باد! اب کے ہوا مختلف ہے

اب کے بالکل نئے رنگ سے لکھ رہے ہیں سخن ور قصیدے
حرف تو سب کے سب ہیں رجز کے مگر مدعا مختلف ہے

اب کے میں نے کتابِ مساوات ایک ایک ورق پڑھ کے دیکھی
متن میں جانے کیا کچھ لکھا ہے مگر حاشیہ مختلف ہے

خیمۂ عافیت کے طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقتِ شہر
جاننا چاہتی ہے کہ منزل سے کیوں راستہ مختلف ہے

خیمۂ عافیت کے طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقتِ شہر (کردارِ کوفہ و دمشق) سے جڑا ہوا ایک اور ساختیہ ہے، رزق کی محتاجی اور جاہ پرستی کا جو انسان کے ضمیر کو مار دیتی ہے، اور اسے مصلحت کوش، ریاکار اور غرض کا بندہ بنا دیتی ہے۔ حرص و آز، ہوس اور لالچ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ جب شہروں، بستیوں اور آبادیوں کا کردار جاتا رہے تو عام انسان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ رزق کی مصلحت اور انسان کی بے ضمیری اور تن آسانی پر طنز و تعریض ایسا شعری ساختیہ ہے جو افتخار عارف کے یہاں بار بار اُبھرتا ہے۔ اس میں بھی وہ اکثر و بیشتر خود اپنی ذات کو نشانہ بناتے ہیں، یعنی آج کا انسان ذلت کے اس درجے پر پہنچ گیا ہے کہ اس میں غیرت و عزتِ نفس تک کا شائبہ نہیں رہا، سرکشی کا حوصلہ تو دور کی بات ہے۔ اس ساختیے میں افتخار کی شاعری نے کچھ ایسی کیفیتیں پیدا کی ہیں جو خاص انھی کے شعری نشانات میں سے ہیں۔ ان میں ذات کے حوالے سے عہدِ حاضر کے انسان کی جاہ پرستی، مصلحت اندیشی اور تن آسانی پر شدید چوٹ کی ہے۔ یہ تعریض کچھ اپنا ہی لطف رکھتی ہے:

کہاں کے نام و نسب علم کیا فضیلت کیا
جہانِ رزق میں توقیرِ اہلِ حاجت کیا

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا
دمشقِ مصلحت و کوفۂ نفاق کے بیچ
فغانِ قافلۂ بے نوا کی قیمت کیا
مآلِ عزتِ ساداتِ عشق دیکھ کے ہم
بدل گئے تو بدلنے پہ اتنی حیرت کیا

اب بھی توہینِ اطاعت نہیں ہوگی ہم سے
دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے
روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے

حامی بھی نہ تھے منکرِ غالب بھی نہیں تھے
ہم اہلِ تذبذب کسی جانب بھی نہیں تھے
اس بار بھی دُنیا نے ہدف ہم کو بنایا
اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے
بیچ آئے سرِ قریۂ زر جوہرِ پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے
مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اُتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

ابھی اُٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دستِ کرم
کہ سارا شہر لیے کاسۂ طلب نکلا

کوئی جنوں کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے
بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے

ہم تو سدا کے بندۂ زر تھے ہمارا کیا
نام آورانِ عہدِ بغاوت کو کیا ہوا

قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو خیال بال و پر شاید نہ آئے

یہ مضمون خاص افتخار عارف کا ہے۔ انھوں نے اپنی کئی نظموں میں بھی یہی سوال اُٹھایا ہے اور جاہ پرستی، رزق کی مصلحت اور زر طلبی پر چوٹ کرتے ہوئے آج کے انسان کو خبردار کیا ہے کہ وہ تن آسانی کا شکار ہوگیا ہے اور بزرگوں کا لہو اُسے آواز نہیں دیتا۔ ''آخری آدمی کا رجز'' میں فغانِ خلق اہل طائفہ کی نذر ہو چکی ہے اور چاروں طرف سکون ہی سکون ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کی دو مختصر نظمیں بھی قابلِ توجہ ہیں:

ایک سوال

میرے آبا و اجداد نے حرمتِ آدمی کے لیے
تا ابد روشنی کے لیے
کلمۂ حق کہا
مقتلوں، قید خانوں، صلیبوں میں بہتا لہو ان کے ہونے کا اعلان کرتا رہا
وہ لہو حرمتِ آدمی کی ضمانت بنا
تا ابد روشنی کی علامت بنا
اور میں پا برہنہ سرِ کوچۂ احتیاج

رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی

سوچتا رہ گیا

جسم میں میرے اُن کا لہو ہے تو پھر یہ لہو بولتا کیوں نہیں؟

اِنیِ کُنتُ مِنَ الظّٰا لِمِین

پڑھا تو یہ تھا زمینِ عنبر پہ کشتِ خاشاک کرنے والے نہیں رہیں گے

سنا تو یہ تھا ہوا کے ہاتھوں پہ بیعت خاک کرنے والے نہیں رہیں گے

مگر ہوا یوں کہ نیزۂ شام پر سرِ آفتاب آیا

امانتِ نور جس کے ہاتھوں میں تھی اُسی پر عذاب آیا

اور اب مرے کم حلیف و کم حوصلہ قبیلے کے لوگ مجھ سے یہ پوچھتے ہیں

ہماری قبریں کہاں بنیں گی؟

خیامِ تسلیم و سائبانِ رضا کی ویرانیاں بتائیں

جو اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کا خون دیکھیں اب ایسی مائیں کہاں سے لائیں

یہ سارے ساختیے مل کے ایک قوتِ شفا کو راہ دیتے ہیں، جس کے بغیر شعر، شعر تو رہتا ہے اس میں تاثیر پیدا نہیں ہوتی، اور وہ کیفیت نہیں آتی جو زمانوں اور زمینوں کے فرق کو معدوم کر سکتی ہے۔ افتخار عارف کے لاشعور میں ظلم و تعدّی، بے زمینی و بے گھری، بے حرمتی و تباہی اور بربادی، نیز منافقت، مصلحت اندیشی اور الم و اندوہ کی سچائی و اصلیت کا سارا منظر نامہ اپنی گوناگوں استعاراتی و علامتی کیفیات کے ساتھ اس حد تک پیوست ہے کہ اُن کا پورا احساس و اظہار اس میں ڈوبا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ''مہرِ دونیم'' کے شائع ہوتے ہی جدید شاعروں میں افتخار عارف نے اپنی شناخت یک لخت سب سے الگ کر لی، اور ان کی انفرادیت فوری طور پر تسلیم کی

جانے لگی۔ یہ درد جب پوری شعری شخصیت اور شعری وجود کا حصہ بن کر باطن کی آگ میں تپ کر ظاہر ہوتا ہے تو ایک عجیب یقین میں ڈھلتا ہے اور ایک دُعائیہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے بشارت کا نور برستا ہوا معلوم ہوتا ہے:

سرِ شاخ صبح کھلا گلاب یقین کا
یہ مرا یقینِ کرم ہے ایک امین کا

یہ نمود و نام مرے وجود کی بازگشت
یہ مرا وجود غبار میری زمین کا

مری ٹوٹ پھوٹ مری نظر کی شکست و ریخت
یہ شکست و ریخت حجاب فتحِ مبین کا

میں وہ ہوں کہ میرے چہار سمت غنیم اور
مجھے اعتبار یسار کا نہ یمین کا

کبھی میرے نام سے بھی کوئی سندِ وفا
کبھی میرے حق میں بھی فیصلہ ہو زمین کا

چلو آؤ شہرِ گماں میں چل کے صدا لگائیں
کہ وہیں کہیں سے ملے گا اجر یقین کا

کبھی کھل کے لکھ جو گزر رہا ہے زمین پر
کبھی قرض بھی تو اتار اپنی زمین کا

○

اشفاق حسین

پیش لفظ

یہ ۱۹۸۲ء کے موسمِ خزاں کی بات ہے، ٹورنٹو میں پہلی بار ایک عالمی اُردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس کے ساتھ ہی مشاعروں کا بھی سلسلہ تھا جو کینیڈا اور امریکا کے مختلف شہروں تک پھیلا ہوا تھا — اسی سلسلے کا ایک مشاعرہ لاس اینجلس میں ہونے والا تھا جہاں لندن سے افتخار عارف کے علاوہ احمد فراز بھی مدعو تھے جو ان دنوں لندن میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ لاس اینجلس کے اس مشاعرے میں مجھے بھی ٹورنٹو سے مدعو کیا گیا تھا اور ہم تینوں مہمانوں کا قیام سید محمد جعفری مرحوم کے فرزند احمد جعفری کے گھر پر تھا۔ احمد ان دنوں اکیلے ہی رہتے تھے اور انھیں صبح بہت ہی سویرے دفتر جانا پڑتا تھا — مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ چلو اب تمھارے آنے سے ایک مسئلہ تو حل ہوگیا کہ کم از کم مہمانوں کو صبح کا ناشتا وقت پر مل جایا کرے گا۔ رات کو ہم لوگ کھانے سے واپس آئے تو احمد جعفری فوراً سونے چلے گئے اور ہم لوگ بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ غالباً صبح تین ساڑھے تین بجے کے قریب ہم بھی سونے چلے گئے اور میرا خیال تھا کہ اب ہم تینوں بہت اطمینان سے دیر تک سونے کے بعد اُٹھیں گے مگر صبح معاملہ اس کے بالکل برعکس نکلا، یعنی جو اصل مہمان تھے وہ خود اپنے لیے چائے وائے بنا کر پی چکے تھے اور میرے اُٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب افتخار نے میرے منہ پر پانی کا چھڑکاؤ کیا اور کہا، ''ابے اشفاق اب اُٹھو بھی، کب سے

جگا رہے ہیں تم کو۔'' تو معلوم ہوا کہ دونوں ہی مہمان علی الصبح اُٹھنے کے عادی ہیں۔ ایک چہل قدمی کے لیے اور دوسرا اوّلِ وقت نمازِ فجر کے لیے۔ یہ دوسری شخصیت افتخار عارف کی تھی۔ افتخار عارف کی شاعری میں جا بجا بکھرے ہوئے مذہبی استعاروں سے تو سب ہی واقف تھے لیکن ان کے اسٹائل اور شان دار طرزِ زندگی کے سبب جو انھیں اس وقت ''بی سی سی آئی'' کے ایک اعلیٰ عہدے دار، ٹی وی کی ایک اہم شخصیت اور ایک مقبول شاعر کی حیثیت سے حاصل تھی، اس کے ہوتے ہوئے کسی کو شاید یہ خیال تک نہ آتا ہوگا کہ اس خوش لباسی اور ہنستے مسکراتے چہرے کے پیچھے کوئی ایسا پیوند بھرا پیراہن بھی ہے جو فقیروں اور درویشوں ہی کے بدن پر جچتا ہے۔ میری طرح کچھ اور بھی ایسے لوگ تھے جنھیں اُس وقت تک ان کے بہت زیادہ قریب رہنے کا موقع نہیں ملا تھا، وہ بھی غالباً اس خیال کے تھے کہ افتخار کا یہ مذہبی رویہ اور صوفیانہ انداز صرف شاعری برائے شاعری کے دائرے تک ہی محدود ہے اور اس کا تعلق زندگی کے اصل دھاروں سے نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ تاثر اس گفتگو سے اور بھی ملتا تھا کہ جو اُن کی صحبت میں اکثر و بیشتر ہوا کرتی تھی۔ وہ محفلِ یاراں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو اس مقولے پر عمل کرتے ہیں کہ جان اگر جاتی ہے تو جائے مگر کوئی جملہ بے کار نہ جائے۔ مجھے اُس وقت تک ان کے ساتھ جن محفلوں میں اُٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا، عموماً ان محفلوں میں موسیقی، کتابوں، فلموں، کرکٹ، سیاست، اور زیادہ تر شعر و ادب کا ہی چرچا رہا کرتا تھا۔ لاس اینجلس کی اُس صبح مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میرا تو اس عابدِ شب زندہ دار اور اوّل وقت نمازِ صبح پڑھنے والے افتخار عارف سے مکمل تعارف ہی نہیں تھا۔ شاید اسی لیے یہ مثل مشہور ہے کہ اگر کسی کو پرکھنا ہو تو اُس کے ساتھ سفر کرو۔ مجھ پر بھی اس سفر کے دوران بہت سا وقت ایک ساتھ گزارنے ہی کی بنا پر افتخار عارف کی شخصیت کے بہت سے گوشے منکشف ہوئے۔ ایسا صرف میرے ساتھ ہی نہیں ہوا بلکہ افتخار عارف کے حوالے سے کچھ اور لوگوں کو بھی مختلف موقعوں پر اس سے ملتی جلتی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

ایک جگہ ممتاز مفتی نے بھی ان کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں کسی اور حوالے سے ایسی ہی ایک بات لکھی تھی کہ ''لوگ سمجھتے ہیں کہ افتخار عارف کی باتیں پھلجھڑیاں ہیں۔ میں بھی اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا، پھر ایک دن دِلّی کے اشوکا ہوٹل میں مجھ سے فاش غلطی سرزد ہوگئی۔ اس کا

انٹرویو لینے کے لیے میں نے اسے چھیڑ دیا۔ بھڑوں کا چھتا چھڑ گیا۔ انتقاماً اس نے اپنی آپ بیتی چھیڑ دی۔ ایک دم منظر بدل گیا۔ پروا چلنے لگی۔ گھور گھٹائیں چھا گئیں۔ افتخار یوں موسلا دھار برسا کہ نہ افتخار عارف رہا نہ ممتاز مفتی، نہ اشوکا ہوٹل رہا نہ دلّی۔ سب پانی پانی ہو گیا، سب ڈوب گئے۔ تب میں نے جانا کہ قدرت کنول کا پھول کھلانے کے لیے پہلے جھیل بناتی ہے، چھل چھل چھلکتی جھیل، گلاب کا پھول کھلانے کے لیے پہلے کانٹے لگاتی ہے۔'' ممتاز مفتی نے یہ جاننے کے بعد ہی افتخار کی شخصیت کو دو منزلوں میں تقسیم کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ''شہرت کی چاندنی میں افتخار عارف خوب نہایا۔ انداز میں وحشتیں جاگیں۔ who cares ہٹاؤ چھوڑو کے رویے ظاہر ہونے۔ محبوبیت نے لشکارے مارے، سب کچھ ہوا لیکن یہ سب کچھ اوپر کی منزل میں ہوا، نیچے کی منزل میں وہی لاوارثی کا اندھیرا، دُکھ کی بھیگ، تلخ یادوں کے مکڑے جالے تنتے رہے۔''
ممتاز مفتی نے دو منزلوں کی طرف تو واضح اشارہ کر دیا، مگر ان دونوں منزلوں سے نیچے بھی ایک منزل ہوتی ہے جسے تہ خانہ یا ہمارے شمالی امریکا میں بیسمنٹ (Basement) کہا جاتا ہے۔ یہاں باہر کی روشنی کم کم ہوتی ہے لیکن اندر کی چاندنی ہر بنِ مو سے نپکتی ہے۔ افتخار عارف کی مذہبی شخصیت یہیں سے اکتسابِ نور کرتی ہے۔ یہ ان کی اپنی ذات کا غارِ حرا ہے اور یہیں ان کی تخلیقی شخصیت کا وہ پہلو جگمگاتا ہے جس کے بارے میں خود انھوں نے کہا ہے کہ:

مدینہ و نجف و کربلا میں رہتا ہے
دل ایک وضع کی آب و ہوا میں رہتا ہے

یہ جو ایک خاص وضع کی آب و ہوا ہے، یہ رثائی ادب کی تخلیق کی ضمانت ہے اور اس کا اظہار کوئی نیا نہیں ہے۔ جن زبانوں سے مسلمانوں کا سابقہ کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال سے رہا ہے، ان سب میں رثائی ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اردو میں خصوصیت کے ساتھ یہ روایت بہت گہری اور جان دار رہی ہے۔ رثائی ادب کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں رسمی نقش و نگار کافی نہیں ہوتے، بلکہ جب تک اس میں عشق اور سرشاری کی کیفیت شامل نہ ہو اس کے سارے نقش پانی پر بنے ہوئے نقش ہی ثابت ہوتے ہیں۔ جب تک دل میں عقیدت کے دریا ٹھاٹھیں نہ مار رہے ہوں اور عشق کی چنگاری نہ لگی ہو، اُس وقت تک نری شاعرانہ مہارت کلام میں کوئی

تاثیر پیدا نہیں کر سکتی۔ انیس اور اقبال اور ان کے قبیلے کے سیکڑوں شاعروں کا کلام عقیدت کے انھی سرچشموں سے سیراب ہونے کی وجہ سے ہی زندۂ جاوید ہے۔ ہمارے دور میں افتخار عارف بھی اسی قبیلے کا پرچم اٹھائے ہوئے ہیں مگر ذرا ایک منفرد انداز سے۔

''مہرِ دونیم'' کی اشاعت سے قبل ہی ان کے لہجے کی انفرادیت نے جو اپنے مختلف رنگ دکھلانے شروع کر دیے تھے ان میں سے ایک رنگ کربلا کے استعارے سے بھی سرخی لے رہا تھا۔ افتخار عارف کی شاعری کا بنیادی خمیر شروع سے ہی رثائی ادب کی روایتوں سے اپنا رشتہ جوڑ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پہلے شعری مجموعے میں شائع ہونے والے دونوں تعارفی مضامین میں فیض احمد فیض اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس کی طرف باقاعدہ توجہ دلوائی تھی۔

فیض نے ان کے بارے میں یوں ہی تو نہیں کہا تھا کہ انھوں نے جدید مضامین و مطالب کی ادائیگی میں روایت کے خزینے سے یوں کسبِ فیض کیا ہے کہ تلمیح کو علامت اور علامت کو استعارے کا رُوپ دے کر نظم اور غزل دونوں کے لیے رمز و کنایہ کا نیا سامان پیدا کیا ہے۔ اس ضمن میں اب سے پہلے عشق و طلب، ایثار و جاں فروشی، جبر و تعدی کا بیان صرف منصور و قیس اور فرہاد و جم کے حوالے سے کیا جاتا تھا۔ پھر جب گھر میں دار و رسن کی بات چلی تو مسیح و صلیب کے حوالے بھی آ گئے، لیکن المیہ کربلا اور اس کے محترم کرداروں کا ذکر بیشتر سلام اور مرثیے تک محدود رہا۔ صرف اقبال کی نگاہ وہاں تک پہنچی:

خونِ حسین باز دہ کوفہ و شام خویش را

یا

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں

افتخار عارف نے گزارشِ احوال واقعی کے لیے اس ماخذ سے بہت اثر آفرین اور خیال افروز کام لیا ہے۔ اسی طرح نارنگ صاحب نے بھی ''مہرِ دونیم'' کے پیش لفظ میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ افتخار عارف (اپنی شاعری میں) بار بار جس شہر کا حوالہ لاتے ہیں وہ اُردو کی تخلیق اور ثقافتی روایت کے اجتماعی لاشعور میں بسا ہوا ظلم و استبداد کا کہیں کوئی قدیمی نشان تو نہیں ہے؟ ان سوالوں کے جوابات ''مہرِ دونیم'' ہی کے صفحات پر موجود تھے جب کہ ''حرفِ باریاب'' اور

''جہانِ معلوم'' نے اس پر مزید گہری مہر ثبت کر دی۔ پھر یہ خوشبو صرف ان کتابوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ دریاؤں، سمندروں اور ملکوں کی سرحدوں کو چیرتی ہوئی دلوں تک پہنچ گئی۔

یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب سے چند برس قبل نیو جرسی کی ایک ایسی محفل میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں رثائی ادب کا چراغ پورے آب و تاب سے فروزاں تھا۔ اس محفل کے میزبان جناب جعفر نقوی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے بڑے عجز و انکسار سے کہا کہ میں خود تو شاعر نہیں ہوں، لیکن میرا بہت جی چاہتا ہے کہ آج کی اس محفل کا آغاز اپنے ایک پسندیدہ شاعر کے کلام سے کروں اور پھر انھوں نے یہ چند خوب صورت اشعار نذرِ سامعین کیے:

شرف کے شہر میں ہر بام و در حسین کا ہے
زمانے بھر کے گھرانوں میں گھر حسین کا ہے

فراتِ وقتِ رواں دیکھ سوئے مقتل دیکھ
جو سر بلند ہے اب بھی وہ سر حسین کا ہے

زمین کھا گئی کیا کیا بلند و بالا درخت
ہرا بھرا ہے جو اب بھی شجر حسین کا ہے

سوالِ بیعتِ شمشیر پر جواز بہت
مگر جواب وہی معتبر حسین کا ہے

کہاں کی جنگ کہاں جا کے سر ہوئی کہ اب
تمام عالمِ خیر و خبر حسین کا ہے

محبتوں کے حوالوں میں ذکر آنے لگا
یہ فضل بھی تو مرے حال پر حسین کا ہے

حضورِ شافعِ محشر، علیؑ کہیں کہ یہ شخص
گناہ گار بہت ہے مگر حسین کا ہے

جعفر نقوی صاحب نے ان اشعار کو بہت خوب صورت لہجے میں تحت اللفظ کے ساتھ سنایا اور حاضرینِ محفل نے ہر ہر شعر پر خوب خوب داد دی۔ ان اشعار کے خالق کا نام ہی نہیں بلکہ اس محفل

میں موجود تقریباً سبھی کو اس "سلام" کے اشعار تک یاد تھے۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس وقت تک جعفر صاحب کی افتخار عارف سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح کئی برس گزر گئے اور پھر ایک بار جعفر نقوی اور ان کی بیگم زہرا نقوی صاحبہ نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں افتخار عارف کے صرف مذہبی کلام کا ایک انتخاب مرتب کردوں جسے میں نے بخوشی قبول کرلیا۔ اس میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی کیوں کہ ان کا بیشتر کلام ان کے تینوں مجموعہ ہائے کلام میں شامل تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ یہ سب کلام ان کی نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ شائع ہوا تھا۔ چنانچہ وہ احباب جو صرف ان کا رثائی کلام پڑھنا چاہتے ہیں، ان کے ذوق کی تسکین کے لیے شاید یہ کتاب کچھ وجہِ طمانیت ہو۔ اگر ایسا ہو سکے تو میں سمجھوں گا کہ اس طرح نہ صرف یہ کہ جعفر صاحب اور ان کی بیگم زہرا صاحبہ کی خواہش پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے گی بلکہ خود مجھے بھی بے انتہا خوشی ہوگی۔

"شہرِ علم کے دروازے پر" میں ان کے تینوں مجموعوں کے علاوہ ایسا غیر مطبوعہ کلام بھی ہے جو محفلوں اور مجلسوں میں پڑھا گیا۔ اس کے لیے میں افتخار عارف صاحب کا بہت ہی شکر گزار ہوں۔ افتخار عارف کی ذاتی درخواست پر ممتاز دانشور اور سیاسی مدبر اور بین الاقوامی شہرت کے حامل مصور جناب حنیف رامے نے کتاب کے لیے خوب صورت سرورق بنایا جس کے لیے شاعر کے ساتھ ساتھ ہم سب اُن کے احسان مند ہیں۔ ممتاز و مایہ ناز ادیب انتظار حسین اور منفرد اور صاحبِ اسلوب شاعر نصیر ترابی نے کتاب کے لیے اپنے تاثرات عطا فرمائے، ان کا شکریہ بھی ہم سب پر واجب آتا ہے۔ مکتبۂ دانیال کی حوری نورانی صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے بہت اہتمام کے ساتھ افتخار عارف کے تمام مجموعے شائع کیے اور اس مرتب شدہ کتاب کو بھی شائع کرنے کی زحمت فرمائی۔ آخر میں ایک بار پھر میں جعفر نقوی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ ان کی خواہش اور اصرار کے سبب یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

○

مکالمہ

''ہوا کے پردے میں کون ہے جو چراغ کی لَو سے کھیلتا ہے

کوئی تو ہوگا

جو خلعتِ انتساب پہنا کے وقت کی رَو سے کھیلتا ہے

کوئی تو ہوگا

حجاب کو رمزِ نور کہتا ہے اور پرتو سے کھیلتا ہے

کوئی تو ہوگا!''

''کوئی نہیں ہے

کہیں نہیں ہے

یہ خوش یقینوں کے، خوش گمانوں کے واہمے ہیں جو ہر سوالی سے بیعتِ اعتبار لیتے ہیں

اس کو اندر سے مار دیتے ہیں

کوئی نہیں ہے

کہیں نہیں ہے!''

''تو کون ہے وہ جو لوحِ آبِ رواں پہ سورج کو ثبت کرتا ہے اور بادل اُچھالتا ہے

جو بادلوں کو سمندروں پر کشید کرتا ہے اور بطنِ صدف میں خورشید ڈھالتا ہے

وہ سنگ میں آگ، آگ میں رنگ، رنگ میں روشنی کا امکان رکھنے والا

وہ خاک میں صوت، صوت میں حرف، حرف میں زندگی کا سامان رکھنے والا!''

''نہیں کوئی ہے

کہیں کوئی ہے

کوئی تو ہوگا!''

حجابِ شب میں تب و تابِ خواب رکھتا ہے
درونِ خواب ہزار آفتاب رکھتا ہے

کبھی خزاں میں کھلاتا ہے رنگ رنگ کے پھول
کبھی بہار کو بے رنگ و آب رکھتا ہے

کبھی زمین کا منصب بلند کرتا ہے
کبھی اِسی پہ بِنائے عذاب رکھتا ہے

کبھی یہ کہتا ہے سورج ہے روشنی پہ گواہ
کبھی اِسی پہ دلیلِ حجاب رکھتا ہے

کبھی فغاں کی طرح رائگاں اثاثۂ حرف
کبھی دُعا کی طرح مستجاب رکھتا ہے

کبھی برستے ہوئے بادلوں میں پیاس ہی پیاس
کبھی سراب میں تاثیرِ آب رکھتا ہے

بشارتوں کی زمینیں جب آگ اُگلتی ہیں
اِس آگ ہی میں گلِ انقلاب رکھتا ہے

میں جب بھی صبح کا انکار کرنے لگتا ہوں
تو کوئی دل میں مرے آفتاب رکھتا ہے

سوال اٹھانے کی توفیق بھی اُسی کی عطا
سوال ہی میں جو سارے جواب رکھتا ہے

میں صابروں کے قبیلے سے ہوں مگر مِرا رب
وہ محتسب ہے کہ سارے حساب رکھتا ہے

یا سریع الرضا اغفرلمن لا یملک الا الدعا

اے جلدی راضی ہوجانے والے (میرے معبود) مجھے بخش دے، میرے پاس کوئی پونجی نہیں ہے بجز دعا کے (امام علیؑ)

یہ دُنیا اک سؤر کے گوشت کی ہڈی کی صورت
کوڑھیوں کے ہاتھ میں ہے
اور میں نان و نمک کی جستجو میں در بدر قریہ بہ قریہ مارا مارا پھر رہا ہوں
ذرا سی دیر کی جھوٹی فضیلت کے لیے
ٹھوکر پہ ٹھوکر کھا رہا ہوں، ہر قدم پر منزلِ عز و شرف
سے گر رہا ہوں
اور مری انگشتری پر یا علیؑ لکھا ہوا ہے
مگر انگشتری پر یا علیؑ کندہ کرا لینے سے کیا ہوگا کہ دل تو
مرحبوں کی دسترس میں ہے
مسلسل نرغۂ حرص و ہوس میں ہے

(عجب عالم ہے آنکھیں دیکھتی ہیں اور دل سینوں میں اندھے ہو چکے ہیں)

اور ایسے میں کوئی حرفِ دعا اک خواب بنتا ہے

کبھی سلمانؑ آتے ہیں

کبھی بوذرؓ، کبھی میثمؓ، کبھی قنبرؓ مری ڈھارس بندھاتے ہیں

کمیلؓ آتے ہیں، کہتے ہیں:

پکارو افتخار عارف پکارو!

اپنے مولا کو پکارو، اپنے مولا کے وسیلے سے پکارو

أجیب دعوۃ الداع کا دعویٰ کرنے والے کو پکارو

یہ مشکل بھی کوئی مشکل ہے دل چھوٹا نہیں کرتے

کریم اپنے غلاموں کو کبھی تنہا نہیں کرتے، کبھی رسوا نہیں کرتے!
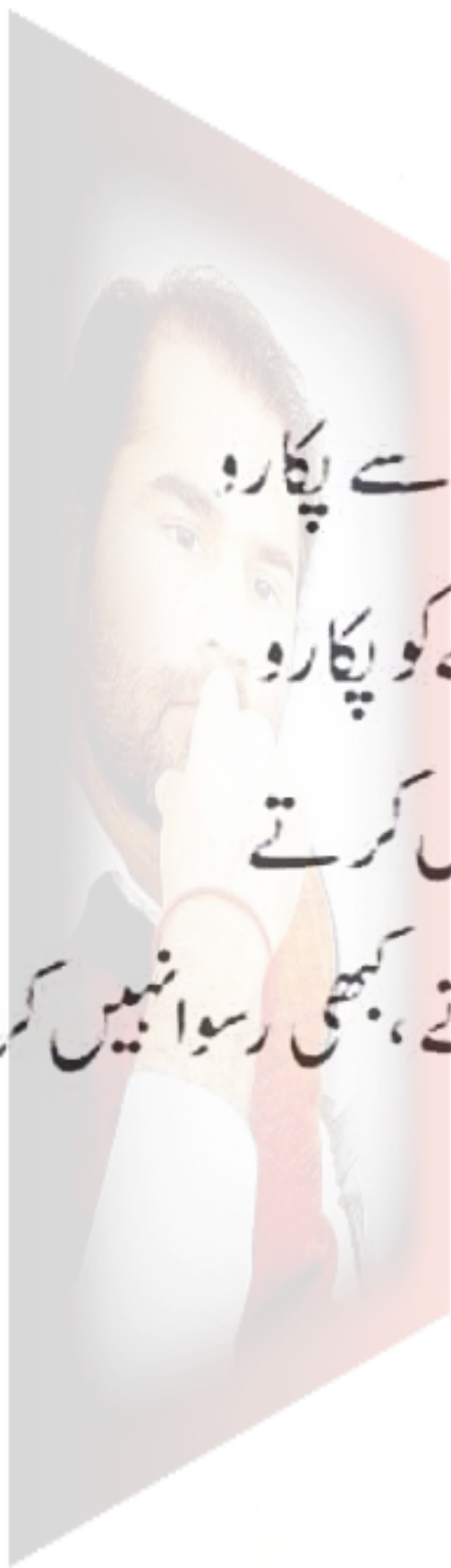
فاذکرونی اذکرکم

(تو تم یاد رکھو مجھ کو، میں یاد رکھوں گا تم کو)

کچھ شعر مکہ مکرّمہ کے لیے

منزلِ ذکر میں ہر شہر پہ چھائے ہوئے شہر
کیا ثنا ہو تری قرآن میں آئے ہوئے شہر

میرے آقاؤں کے مسکن، مرے اللہ کے گھر
میرے نبیوں کی دعاؤں میں بسائے ہوئے شہر

زمزم و کوثر و تسنیم، تسلسل تیرا
چشمۂ خیر کا فیضان اُٹھائے ہوئے شہر

رشکِ سرکارِ دو عالم کے پلٹنے کی تھی دیر
قبلہ رُو ہو گئے سب راہ پہ آئے ہوئے شہر

ایک بوسے کی اجازت حجرِ اسود پر
اے مرے نور کی بارش میں نہائے ہوئے شہر

خاک ہم رتبۂ افلاک ہوئی جن کے سبب
اُن کی آواز سے آواز ملائے ہوئے شہر

مرا شرف کہ تو مجھے جوازِ افتخار دے
فقیرِ شہرِ علم ہوں زکوٰۃِ اعتبار دے

میں جیسے تیسے ٹوٹے پھوٹے لفظ گھڑ کے آ گیا
کہ اب یہ تیرا کام ہے بگاڑ دے سنوار دے

مرے امین آنسوؤں کی نذر ہے قبول کر
مرے کریم اور کیا ترا گناہگار دے

نگاہداریِ بہارِ آرزو کے واسطے!
ہمارے نخلِ جاں کو بھی کوئی نگاہدار دے

ترے کرم کی بارشوں سے سارے باغ کھل اُٹھیں
ہوائے مہر نفرتوں کا سارا زہر مار دے

قیامتیں گزر رہی ہیں کوئی شہسوار بھیج
وہ شہسوار جو لہو میں روشنی اُتار دے

وہ آفتاب بھیج جس کی تابشیں ابد تلک
میں داد خواہ اجر ہوں جزائے انتظار دے
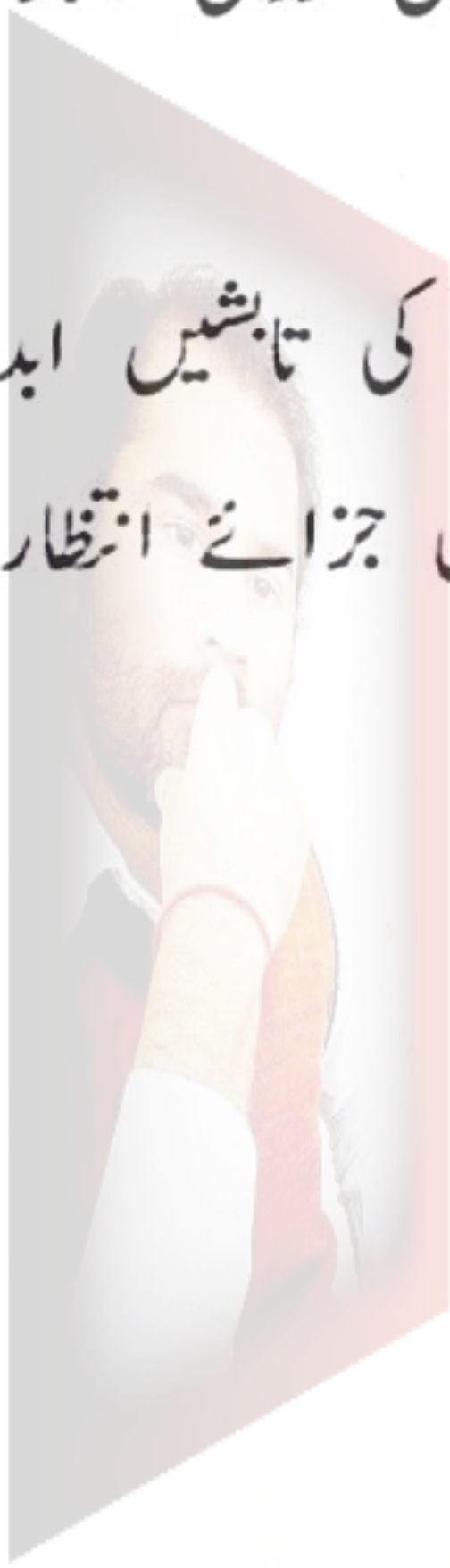
اپنے آقاؐ کے مدینے کی طرف دیکھتے ہیں
دِل اُلجھتا ہے تو سینے کی طرف دیکھتے ہیں

اب یہ دنیا جسے چاہے اُسے دیکھے سرِ سیل
ہم تو بس ایک سفینے کی طرف دیکھتے ہیں

عہدِ آسودگیِ جاں ہو کہ دورِ ادبار
اُسی رحمت کے خزینے کی طرف دیکھتے ہیں

وہ جو پل بھر میں سرِ عرش بریں کھلتا ہے
بس اسی نور کے زینے کی طرف دیکھتے ہیں

بہرِ تصدیقِ سند نامۂ نسبت، عشاق
مہرِ خاتم کے نگینے کی طرف دیکھتے ہیں

دیکھنے والوں نے دیکھے ہیں وہ آشفتہ مزاج
جو حرم سے بھی مدینے کی طرف دیکھتے ہیں

نعت

مدحتِ شافعِ محشر پہ مقرر رکھا
میرے مالک نے مرے بخت کو یاور رکھا

میں نے خاکِ درِ حسانؓ کو سُرمہ جانا
اور ایک ایک سبق نعت کا اَزبر رکھا

میں نے قرآن کی تفسیر میں سیرت کو پڑھا
نور کو دائرۂ نور کے اندر رکھا

نورِ مطلق نے اسے خلق کیا خلق سے قبل
منصبِ کارِ رسالت میں مؤخر رکھا

معنیِ اجرِ رسالت کو سمجھنے کے لیے
زیرِ نگرانیِ سلمانؓ و ابوذرؓ رکھا

خاتمیت کا شرف آپؐ کو بخشا اور پھر
آپ کی دسترسِ خاص میں کوثر رکھا

جس کسی نے بھی کبھی شان میں گستاخی کی
ابد آباد تک اُس شخص کو اَبتر رکھا

تختی لکھی، تو اُسی نام سے آغاز کیا
جس کو معبود نے ہر نام سے اُوپر رکھا

منزلِ شکر کہ ہر گام، خوشی ہو کہ الم
وِرد اک اسمِ گرامی کا برابر رکھا

عمر بھر ٹھوکریں کھاتا نہ پھروں شہر بہ شہر
ایک ہی شہر میں اور ایک ہی دَر پر رکھا

نعت

مدینے کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا
جلال ایسا کہ دل سینے سے نکلا جا رہا تھا

مثالِ فردِ عصیاں تھی کتابِ عمرِ رفتہ
کوئی مجھ میں تھا جو صفحے اُلٹتا جا رہا تھا

بلاوے پر یقیں تھا اور قدم اُٹھتے نہیں تھے
عجب سیلِ اَلم آنکھوں میں اُمڈا آ رہا تھا

ہر اک بولا ہوا جملہ، ہر اک لکھا ہوا لفظ
لہو میں گونجتا تھا اور قیامت ڈھا رہا تھا

اور ایسے میں اُسی اک نام نے کی دستگیری
وہی جو منتہائے ہر دُعا بنتا رہا تھا

بہت نا مطمئن آنکھیں اچانک جاگ اُٹھیں
کوئی جیسے دلِ کم فہم کو سمجھا رہا تھا

مدینہ سامنے تھا، منتظر تھا درِ سخی کا
دلِ آزردہ اپنے بخت پر اِترا رہا تھا

دُعا بعد از دُعا، سجدہ بہ سجدہ، اشک در اشک
میں مشتِ خاک تھا اور پاک ہوتا جا رہا تھا

عہدِ میثاقِ ازل، خلق میں دُہراتا کون
میرے سرکارؐ نہ سمجھاتے تو سمجھاتا کون

نسبتِ یُمنِ قدم کر گئی یثرب کو حرم
وہ نہ ہوتے تو مدینے کی طرف جاتا کون

دو کمانوں سے بھی کم، منزلِ سدرہ سے اُدھر
ایک عالم ہے اُس عالم کی خبر لاتا کون

اُن کی آواز سے اونچی نہ ہو کوئی آواز!
مالک اُلملک نہ فرماتے تو فرماتا کون

پاسِ نسبت نے بہت روک کے رکھا ورنہ
فردِ عصیاں کی طرف دیکھ کے شرماتا کون

جن کی خوشنودیِ خاطر سے ہے نعمت مشروط
ان کے در چھوڑ کے اوروں کی طرف جاتا کون
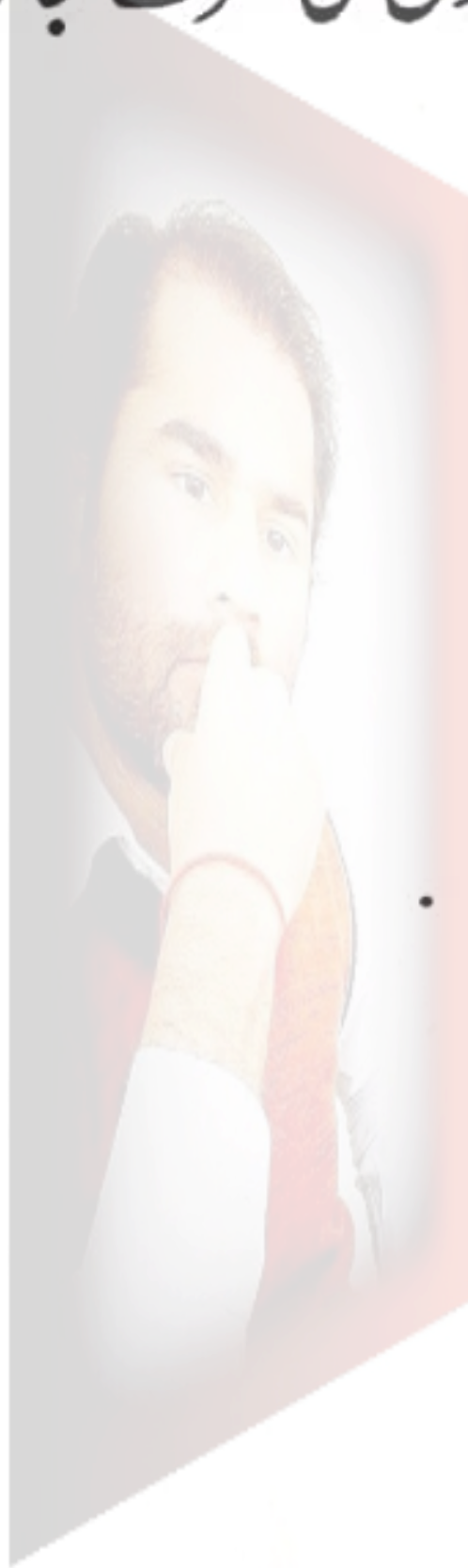
مدینہ و نجف و کربلا میں رہتا ہے
دل ایک وضع کی آب و ہوا میں رہتا ہے

مرے وجود سے باہر بھی ہے کوئی موجود
جو میرے ساتھ سلام و ثنا میں رہتا ہے

میسّر آتی ہے جس شب قیام کی توفیق
وہ سارا دن مرا، ذکرِ خدا میں رہتا ہے

غلامِ بوذرؓ و سلمانؓ دل، خوشی ہو کہ غم
حدودِ زاویۂ ھَل اَتیٰ میں رہتا ہے

درود پہلے بھی پڑھتا ہوں اور بعد میں بھی
اسی لیے تو اثر بھی دعا میں رہتا ہے

نکل رہی ہے پھر اک بار حاضری کی سبیل
سو کچھ دنوں سے دل اپنی ہوا میں رہتا ہے

سبیل ہے اور صراط ہے اور روشنی ہے
اِک عبدِؐ مولیٰ صفات ہے اور روشنی ہے

کتاب و کردار ساتھ ہے اور روشنی ہے
دُرود جزوِ صلوٰۃ ہے اور روشنی ہے

میانِ معبود و عبد میثاقِ نور کے بعد
نظر میں بس ایک رات ہے اور روشنی ہے

حضورؐ غارِ حرا سے بیت الشّرف میں آئے
بس اِک یقیں ساتھ ساتھ ہے اور روشنی ہے

حضورؐ مکّے سے جا رہے ہیں کتاب کے ساتھ
کتاب کُل کائنات ہے اور روشنی ہے

حضورؐ مکے میں آ رہے ہیں کتاب کے ساتھ
کتاب ہی میں نجات ہے اور روشنی ہے

رفیقِ اعلیٰ کا حکم ہے اور کتاب دائم
ابد تک اب انؐ کی ذات ہے اور روشنی ہے

غلامیِ افتخار عارف پہ مہرِ خاتم
ثبوتِ فردِ نجات ہے اور روشنی ہے

بطرزِ مختلف اک نعت لکھنا چاہتا ہوں
میں ساری نعتیں اک ساتھ لکھنا چاہتا ہوں

مرا معبود خود توفیق ارزانی کرے گا
میں وصفِ سرِ موجودات لکھنا چاہتا ہوں

حضورؐ اور محترم وابستگانِ شہرِ حکمت
میں اس بستی کے سب حالات لکھنا چاہتا ہوں

بہت برہم بہت ہی منتشر اوراقِ جاں پر
جہاں تک سانس ہے اثبات لکھنا چاہتا ہوں

دل و دنیا مجھے آواز دیتے ہیں بیک وقت
میں جب بھی صورتِ حالات لکھنا چاہتا ہوں

نہ تسخیرِ طلسم و اسم ہے موضوع میرا
نہ تفسیرِ صفات و ذات لکھنا چاہتا ہوں

نہ استدراک کی معیار بندی میرا منصب
نہ میں ترتیبِ استنباط لکھنا چاہتا ہوں

حضورِ سیّد و سردارؐ جو توقیر پا جائیں
وہی حرفِ شرف دن رات لکھنا چاہتا ہوں

جو میں نہیں کر سکا مرے ہم قلم کریں گے
بصورتِ نعت استغاثہ رقم کریں گے

حضوری و حاضری کے آداب جانتے ہیں
درِ مطہر پہ گفتگو کم سے کم کریں گے

میں کچھ کریموں کے بابِ نعمت سے منسلک ہوں
سو میں جہاں بھی رہوں گا مجھ پر کرم کریں گے

وہ پاک مٹی جو اُن کے قدموں سے مَس ہوئی ہے
ندامتوں کے ہزار اشکوں سے نم کریں گے

خدا جو توفیق دے تو طیبہ کی ہر گلی میں
درودِ پیہم سے جسم و جاں تازہ دم کریں گے

بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ کے آقاؐ اِدھر بھی
بدل جاتی ہے جس سے دل کی دنیا وہ نظر بھی

میں بسم اللہ لکھ کے جب بھی لکھتا ہوں محمدؐ
قلم قرطاس پر آتے ہی جُھک جاتا ہے سر بھی

حرم سے مسجد الاقصیٰ اُدھر سدرہ سے آگے
مسافر بھی عجب تھا اور عجب تھی رہگزر بھی

محمدؐ کے خدا جب بھی کبھی مشکل کا وقت آئے
دُعا کو ہات اُٹھیں اور دُعا میں ہو اثر بھی

بحقِ کفش بردارانِ دربارِ رسالتؐ
ثنا خوانوں میں شامل ہو گیا اک بے ہنر بھی

میں پہلے بھی مشرّف ہو چکا ہوں حاضری سے
خدا چاہے تو یہ نعمت ملے بارِ دگر بھی

دلوں کے ساتھ جبینیں جو خم نہیں کرتے
وہ پاسِ مدحتِ خیرالاممؐ نہیں کرتے

دُعا بغیر، اجازت بغیر، اذن بغیر
ہم ایک لفظ سپردِ قلم نہیں کرتے

کتابِ حق نے جنھیں مصطفےٰؐ قرار دیا
جُز اُن کے اور کوئی ذکر ہم نہیں کرتے

کریم ایسے کہ انعام کرتے جاتے ہیں
جواد ایسے کہ نعمت کو کم نہیں کرتے

جو اُن کے جادۂ رحمت سے منحرف ہو جائیں
زمانے ان کو کبھی محترم نہیں کرتے

میسّر آتی ہے جن کو درود کی توفیق
کسی بھی حال میں ہوں کوئی غم نہیں کرتے

نظر میں طائف و مکہ رہیں تو اُن کے غلام
جواب میں بھی ستم کے، ستم نہیں کرتے
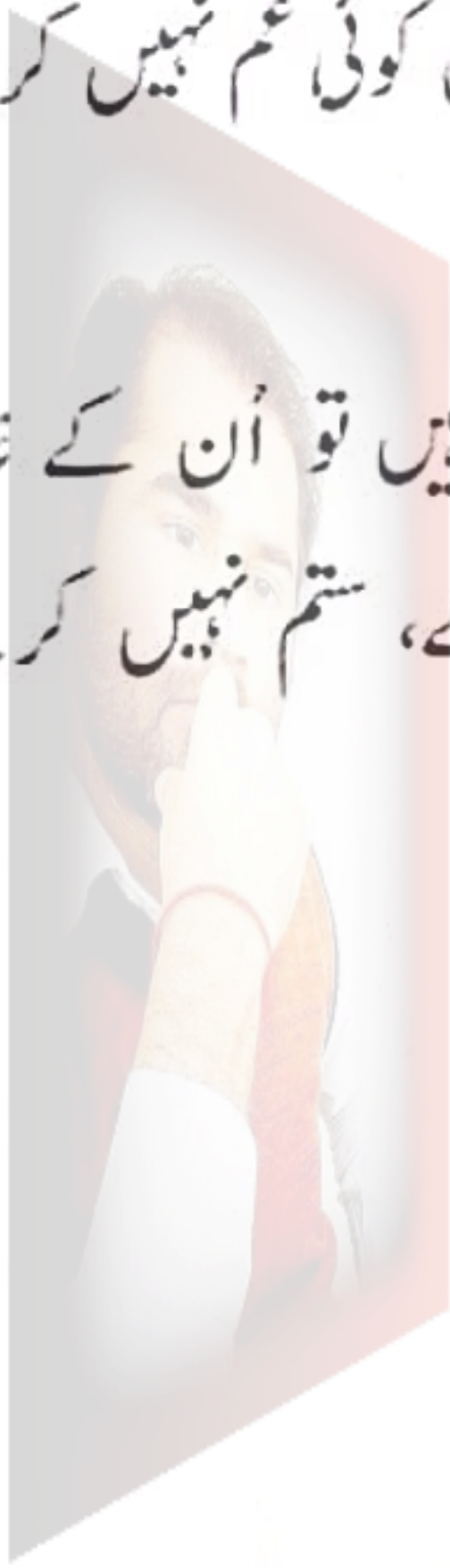
دل و نگاہ کی دُنیا نئی نئی ہوئی ہے
درود پڑھتے ہی یہ کیسی روشنی ہوئی ہے

میں بس یونہی تو نہیں آ گیا ہوں محفل میں
کہیں سے اِذن ملا ہے تو حاضری ہوئی ہے

جہانِ کُن سے اُدھر کیا تھا کون جانتا ہے
مگر وہ نور کہ جس سے یہ زندگی ہوئی ہے

ہزار شکر غلامانِ شاہِ بطحیٰ میں
شروع دن سے مری حاضری لگی ہوئی ہے

ہم تھے دامنِ رحمت سے جب تو چین سے تھے
جدا ہوئے ہیں تو اب جان پر بنی ہوئی ہے

یہ سر اُٹھائے جو میں جا رہا ہوں جانبِ خلد
مرے لیے مرے آقا نے بات کی ہوئی ہے

مجھے یقیں ہے وہ آئیں گے وقت آخر بھی
میں کہہ سکوں گا زیارت ابھی ہوئی ہے
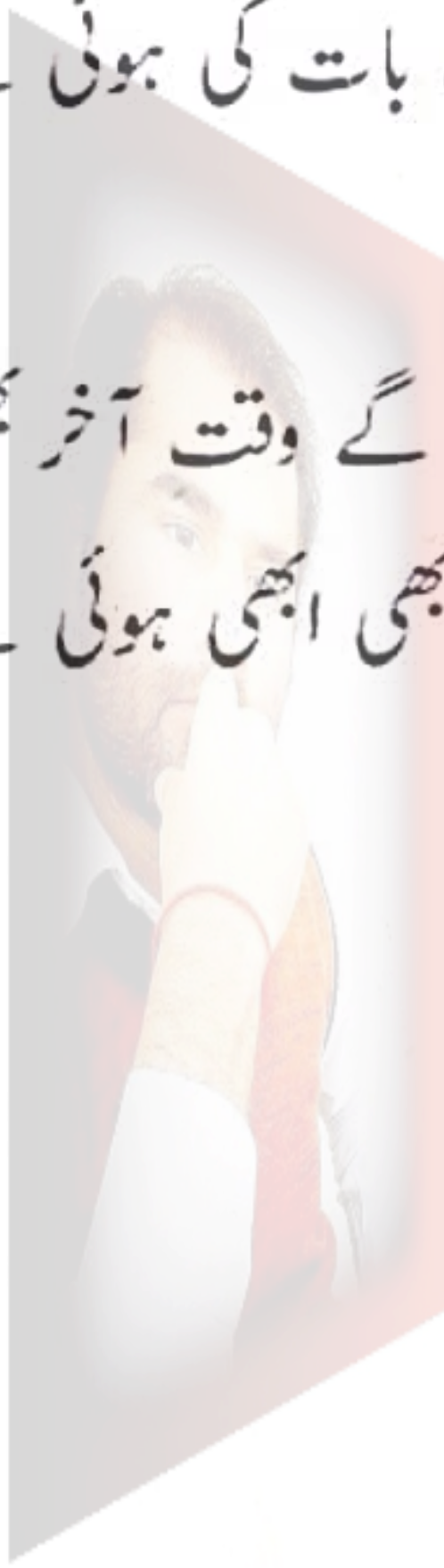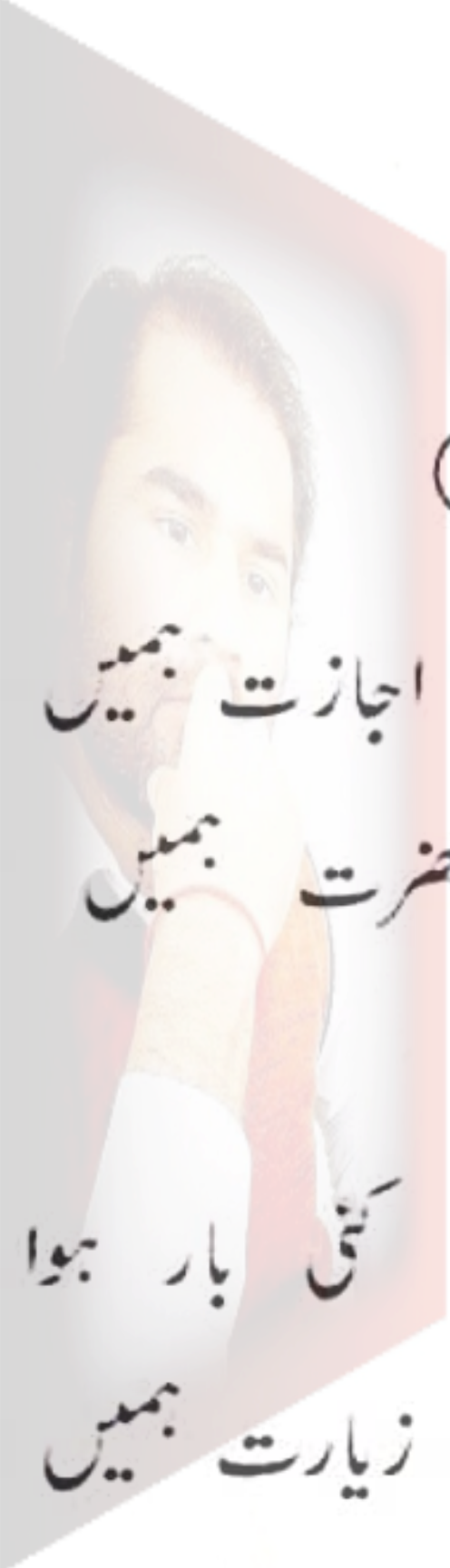
O

مالک نے جو چاہا تو اجازت ہمیں ہو گی
توفیقِ قدم بوسیِ حضرت ہمیں ہو گی

طیبہ کا سفر یوں تو کئی بار ہوا ہے
دل کہتا ہے: اس بار زیارت ہمیں ہو گی

O

نمودِ نور ہے اور غیب ہے شہود میں ہے
مری دُعا کی جزا خود مرے دُرود میں ہے

کتاب و حکمت و خیرِ کثیر و ملکِ عظیم
بڑی جزا ہے مگر ایک ہی وجود میں ہے
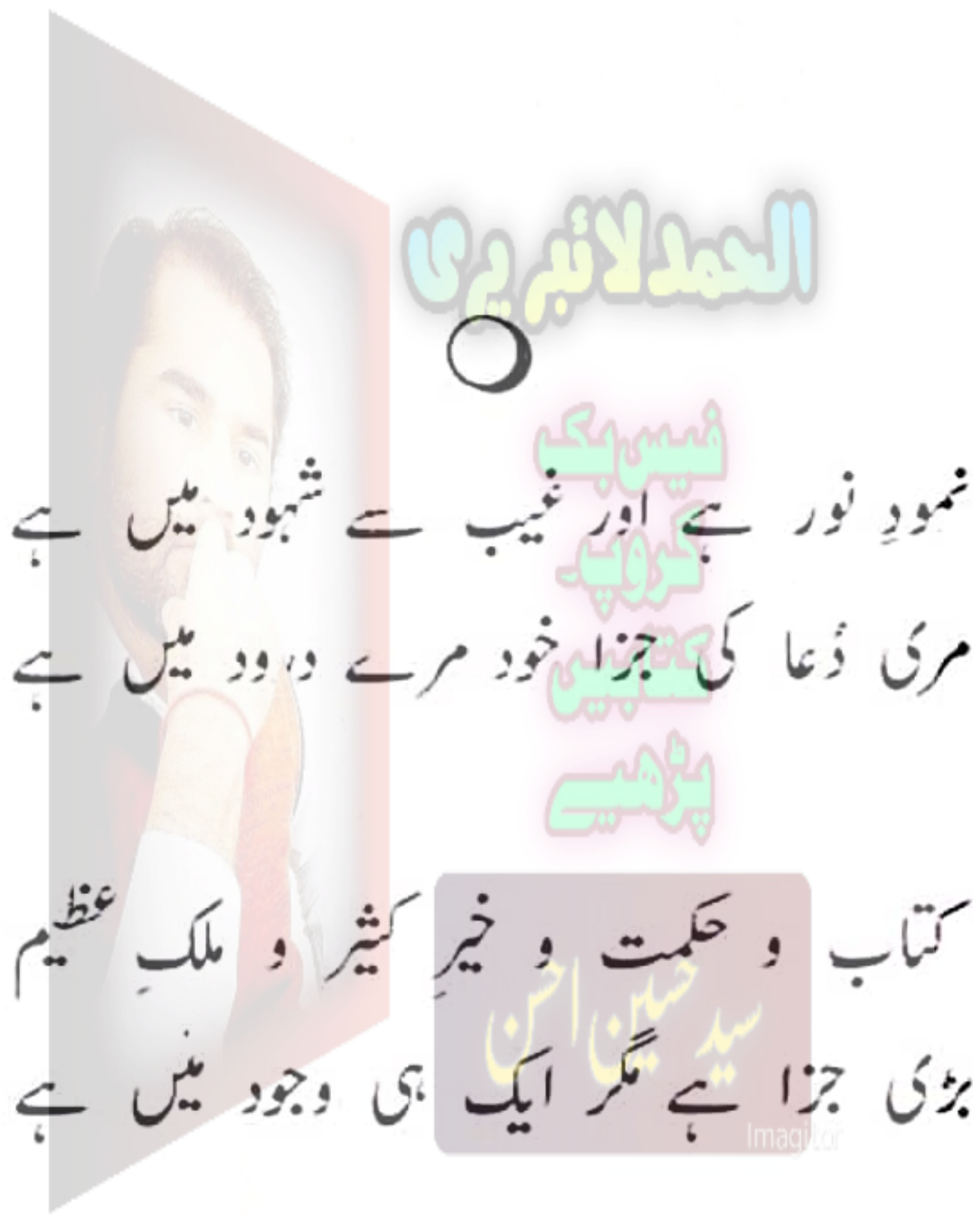
نصر من اللہ...

مرے آقا نے فرمایا کہ لوگو!

سوالِ نور و ظلمت ہے تو آؤ

ہم اپنے انجم و مہتاب لائیں

تم اپنے انجم و مہتاب لاؤ

پھر اس کے بعد یہ دیکھیں کہ خطِ نور کس کے امر کی تصدیق کرتا ہے

کسے حرفِ غلط گردانتا ہے اور کسے صدّیق کرتا ہے

وہی ہے وحشتِ ظلمات و ظلمت

نشانِ آگہی بے نور اندیشوں کی زد میں ہے

شمارِ منزلِ تجدید بابِ مسترد میں ہے

بنامِ انجم و مہتاب اک غولِ بیابانی نے

ایسی خاک اُڑائی ہے کہ سارا مطلعِ خیر و خبر دُھندلا رہا ہے

کہاں کی حُرمت اقدار و افکار
وجودِ خیر پر حرف آ رہا ہے
غبارِ بے نہایت کا سماں ہے
''خداوندا! تری نصرت کہاں ہے؟''
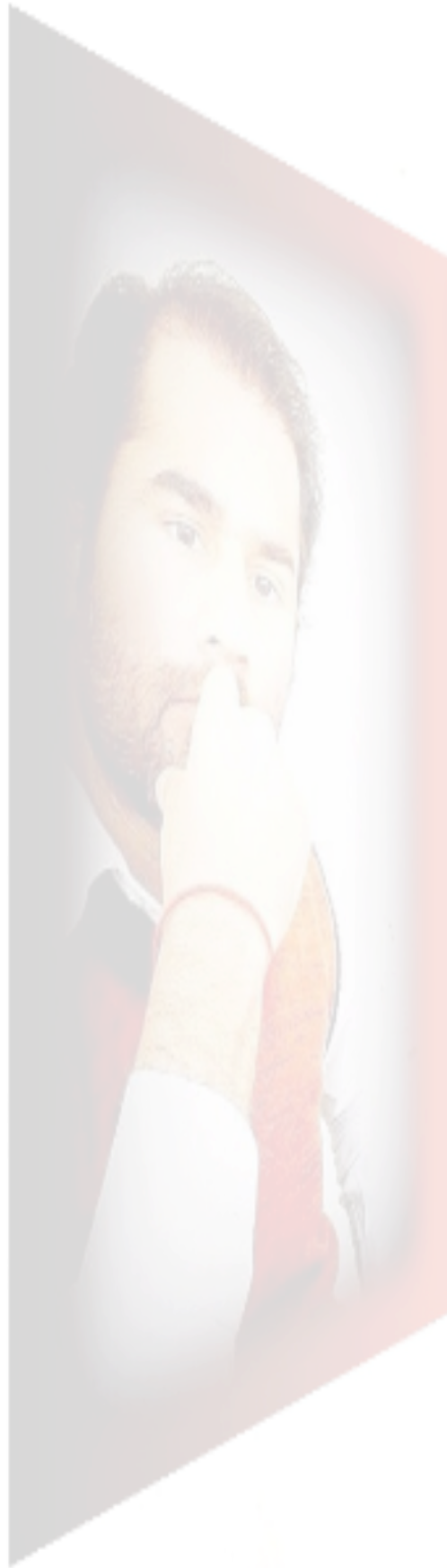
شہرِ علم کے دروازے پر

کبھی کبھی دِل یہ سوچتا ہے
نہ جانے ہم بے یقین لوگوں کو نامِ حیدر سے ربط کیوں ہے
حکیم جانے وہ کیسی حکمت سے آشنا تھا
شجیع جانے کہ بدر و خیبر کی فتح مندی کا راز کیا تھا
علیم جانے وہ علم کے کون سے سفینوں کا ناخدا تھا
مجھے تو بس صرف یہ خبر ہے
وہ میرے مولا کی خوشبوؤں میں رچا بسا تھا
وہ اُن کے دامانِ عاطفت میں پلا بڑھا تھا
اور اس کے دِن رات میرے آقا کے چشم و ابرو جنبشِ لب کے منتظر تھے
وہ رات کو دُشمنوں کے نرغے میں سو رہا تھا تو اُن کی خاطر

جدال میں سر سے پاؤں تک سُرخ ہو رہا تھا تو اُن کی خاطر

سو اُس کو محبوب جانتا ہوں

سو اُس کو مقصود مانتا ہوں

سعادتیں اس کے نام سے ہیں

محبتیں اس کے نام سے ہیں

محبتوں کے سبھی گھرانوں کی نسبتیں اس کے نام سے ہیں!

اِنَّ وَعدَاللہُ حَقّ

سچے لوگ ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں:
سب تعریفیں اس کے لیے ہیں جو فراخِ عزائم ہے
اور جو کشّاف ارادہ ہے
میرے حضورؐ سے میرے خدا کا وعدہ ہے
خیر کے گھر میں جتنے دروازے کھلتے ہیں
اُن میں اِک توبہ کا بھی دروازہ ہے
اشکِ ندامت اپنی جگہ پر آپ بڑا
خمیازہ ہے
میرے حضورؐ سے میرے خدا کا وعدہ ہے

اِنّی کُنتُ مِنَ الظّٰالِمینَ

پڑھا تو یہ تھا: زمینِ عنبر پہ کشتِ خاشاک کرنے والے نہیں رہیں گے
سنا تو یہ تھا ہوا کے ہاتھوں پہ بیعتِ خاک کرنے والے نہیں رہیں گے
مگر ہوا یوں کہ نیزۂ شام پر سرِ آفتاب آیا
امانتِ نور جس کے ہاتھوں میں تھی اُسی پر عذاب آیا
اور اب مرے کم حلیف و کم حوصلہ قبیلے کے لوگ مجھ سے یہ پوچھتے ہیں
ہماری قبریں کہاں بنیں گی؟
خیامِ تسلیم و سائبانِ رضا کی ویرانیاں بتائیں
جو اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کا خون دیکھیں اب ایسی مائیں کہاں سے لائیں!
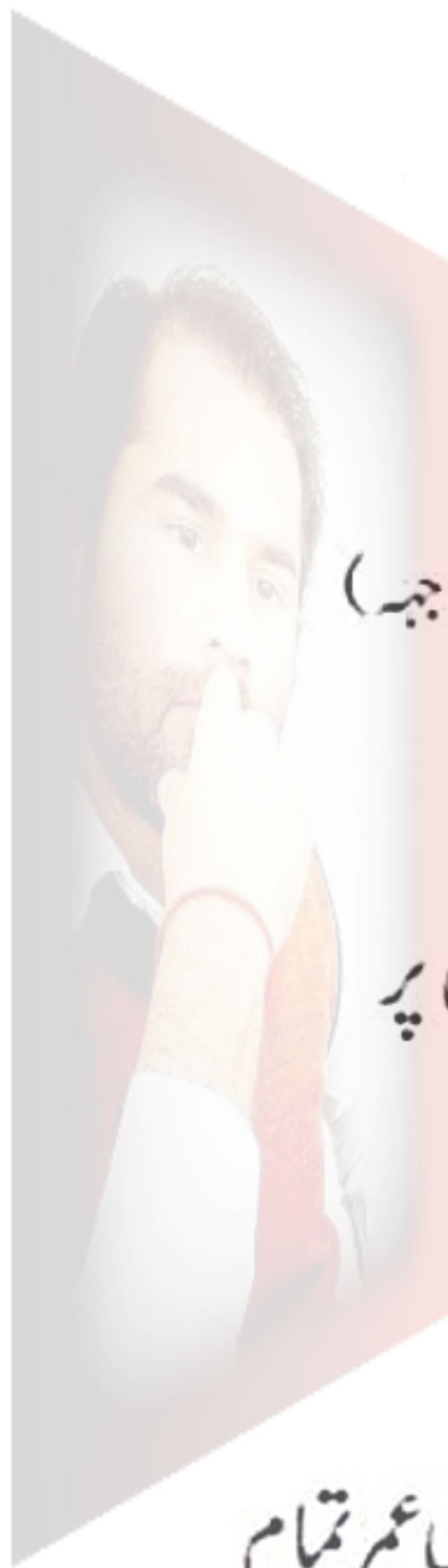
فَتَكَلَّمُوا تُعْرَفُوا

کلام کرو تاکہ پہچانے جاؤ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

دعوت ، ہجرت

بدر، اُحد، خیبر، خندق ایک ایک ورق پر

خطِ جلی سے لکھا ہے اک نام

علیؑ کا نام

علیؑ کے نام کا وِرد و وظیفہ کرتے گزری عمر تمام

اوّل سے آخر تک اسمِ محمدؐ کی تنویر

اعلیٰ، علی، معلّٰی ، عالی نور کی اِک زنجیر

نور کی اِس زنجیر کا حلقہ حلقہ نور نژاد

طیبہ، نجف، کربلا، مشہد، کاظمین ، بغداد

غوث، قطب، ابدال، قلندر، سب کی منزل ایک

ذکر، بیان، کلام، عادت سب کا حاصل ایک
اس حاصل تک جانے والی لہر کا در یا ایک
اس منزل تک جانے والے شہر کا رستہ ایک
شہرِ نورؐ کے اس رستے کی دھول مرا انعام
دعوتِ ہجرت، بدر، اُحد، خیبر، خندق، ایک ایک ورق پر
خطِ جلی سے لکھا ہے اک نام، علیؑ کا نام
علیؑ کے نام کا وِرد و وظیفہ کرتے گزری عمر تمام

اَلعِلمُ حِجَابُ الاَکبَر

علم سب سے بڑا حجاب ہے۔ (حدیثِ قدسی)

کبھی کبھی خود چراغ کی لَو یہ چاہتی ہے

کہ ایک سرکش ہوا کا جھونکا ادھر بھی آئے

جو رات آنکھوں میں چھپ رہی ہے نظر بھی آئے

پھر اس اندھیرے میں ہر مسافر کو جادۂ خیر کے سبھی دیں پناہ یاد آئیں

اپنے مہر اپنے ماہ یاد آئیں

وہ یاد آئیں کہ جن کے انوارِ قدس کی بارشوں میں کونین اپنا گرد و غبار دھولیں

وہ یاد آئیں کہ جن کے ناموں کے اسمِ اعظم کی روشنی ہو تو سنگ بولیں

حجابِ اکبر اُٹھے تو سرِّ وجود کھولیں
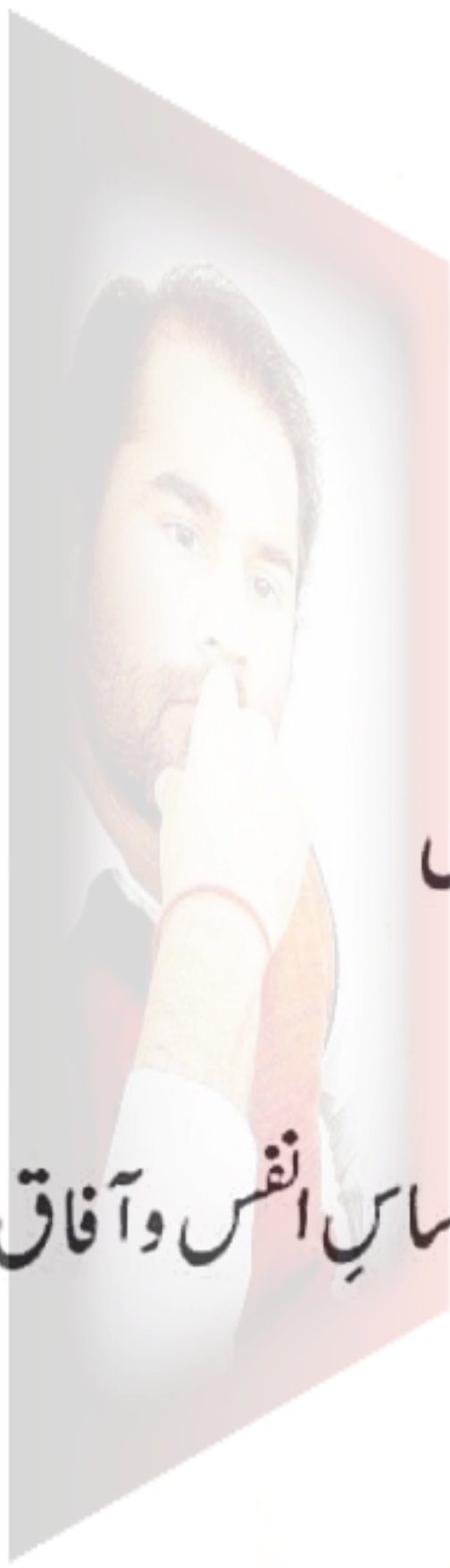
ابو طالبؑ کے بیٹے

جبینِ وقت پر لکھی ہوئی سچائیاں روشن رہی ہیں
تا ابد روشن رہیں گی

خدا شاہد ہے اور وہ ذات شاہد ہے کہ جو وجہِ اساسِ انفس و آفاق ہے
اور خیر کی تاریخ کا وہ بابِ اوّل ہے
ابد تک جس کا فیضانِ کرم جاری رہے گا
یقیں کے آگہی کے روشنی کے قافلے ہر دور میں آتے رہے ہیں
تا ابد آتے رہیں گے

ابو طالبؑ کے بیٹے حفظِ ناموسِ رسالت کی روایت کے امیں تھے
جان دینا جانتے تھے
وہ مسلمؑ ہوں کہ وہ عباسؑ ہوں، عونؑ و محمدؑ ہوں، علی اکبرؑ ہوں، قاسمؑ ہوں، علی اصغرؑ ہوں

حق پہچانتے تھے

لشکرِ باطل کو کب گردانتے تھے

ابو طالبؑ کے بیٹے سر بُریدہ ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں

ابو طالبؑ کے بیٹے پا بجولاں ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں

ابو طالبؑ کے بیٹے صرفِ زنداں ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں

مدینہ ہو، نجف ہو، کربلا ہو، کاظمین و سامرہ و مشہد و بغداد ہو

آلِ ابو طالبؑ کے قدموں کے نشاں

انسانیت کو اس کی منزل کا پتا دیتے رہے ہیں تا ابد دیتے رہیں گے

ابو طالبؑ کے بیٹوں اور غلامانِ علی ابنِ ابی طالب میں اک نسبت رہی ہے

محبت کی یہ نسبت عمر بھر قائم رہے گی

تا ابد قائم رہے گی!

بحضور سیّد الشہدا ؑ

شرف کے شہر میں ہر بام و در حسینؑ کا ہے
زمانے بھر کے گھرانوں میں گھر حسینؑ کا ہے

فراتِ وقتِ رواں! دیکھ سوئے مقتل دیکھ
جو سر بلند ہے اب بھی وہ سر حسینؑ کا ہے

زمین کھا گئی کیا کیا بلند و بالا درخت
ہرا بھرا ہے جو اب بھی شجر حسینؑ کا ہے

سوالِ بیعتِ شمشیر پر جواز بہت
مگر جواب وہی معتبر حسینؑ کا ہے

کہاں کی جنگ کہاں جا کے سر ہوئی ہے کہ اب
تمام عالمِ خیر و خبر حسینؑ کا ہے

محبتوں کے حوالوں میں ذکر آنے لگا
یہ فضل بھی تو مرے حال پر حسینؑ کا ہے

حضورِ شافعِ محشرؐ، علیؑ کہیں کہ یہ شخص
گناہ گار بہت ہے مگر حسینؑ کا ہے

کربلا گواہی دے

کربلا گواہی دے
فاطمہؑ کی بیٹی نے
باپ کی شجاعت کو
صبر سے بدل ڈالا
بھائی کی رفاقت کا
حق ادا کیا کیسا
کربلا گواہی دے

بابِ شہرِ حکمت سے
خیمہ گاہِ نُصرت تک
محضرِ شہادت تک
کیسے کیسے نام آئے

کیا عجب مقام آئے

حق کی پاسداری کو

فرض جاننے والے

راہِ حق میں کام آئے

ساتھ ساتھ تھی زینبؓ

کربلا گواہی دے

پھر وہ شام بھی آئی

جب بہن اکیلی تھی

اک سفر ہوا انجام

ریگِ گرمِ مقتل پر

چند بے کفن لاشے

بھائیوں بھتیجوں کے

گودیوں کے پالوں کے

ساتھ چلنے والوں کے

ساتھ دینے والوں کے

کچھ جلے ہوئے خیمے

کچھ ڈرے ہوئے بچے

جن کا حوصلہ زینبؑ
کربلا گواہی دے

مشہدِ مقدس سے
اک نیا سفر آغاز
جس کی ایک منزل شام
شام شامِ مظلومی
اور وہ خطبۂ زینبؑ
پھر تو برسرِ دربار
پوچھنے لگی دنیا
ظلم کی کہانی میں
داستاں سراؤں کے
حاشیے کہاں تک ہیں
سوچنے لگی دُنیا
منبرِ سلونی کے
سلسلے کہاں تک ہیں
خیر کے تحفظ پر
گھر لٹانے والوں کے

حوصلے کہاں تک ہیں
وقت نے گواہی دی
جبر کے مقابل میں
صبر کا سبق زینبؑ
مصحفِ شہادت کا
آخری ورق زینبؑ

یہ جو دردِ محکم ہے
یہ بھی اک گواہی ہے
یہ جو آنکھ پُرنم ہے
یہ بھی اک گواہی ہے
یہ جو فرشِ ماتم ہے
یہ بھی اک گواہی ہے
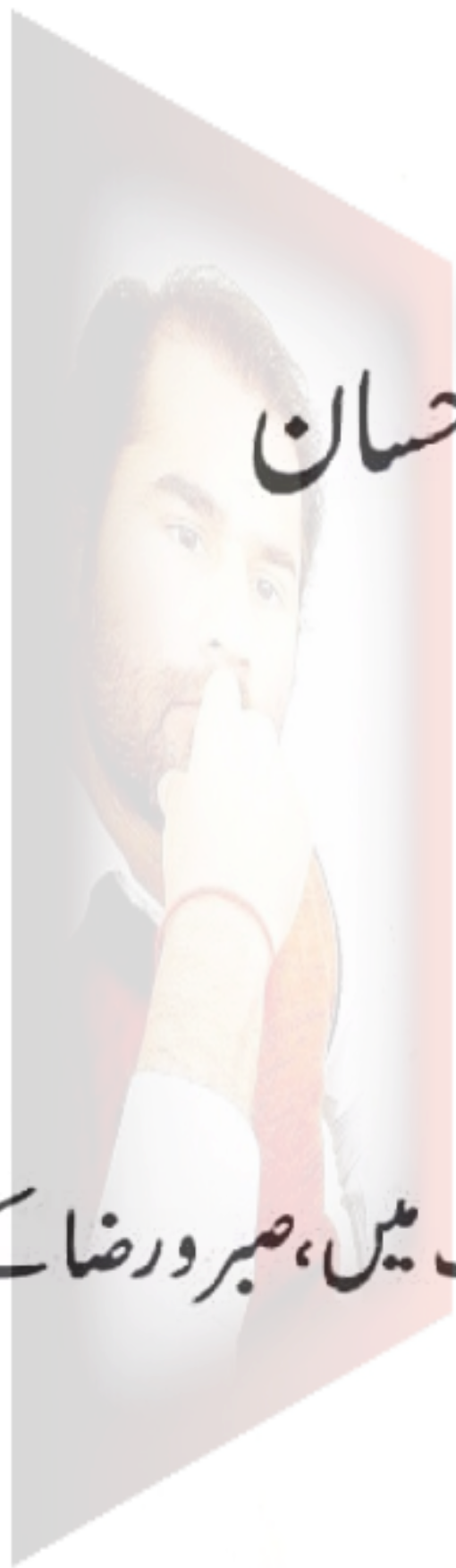
ھل جزاء الاحسانِ الا الاحسان

عجب اک سلسلہ ہے

خدیجہؑ، فاطمہؑ، زینبؑ

وفا کے باب میں، صدق و صفا کے باب میں، صبر و رضا کے باب میں

کیسا منوّر راستہ ہے

خدیجہؑ، فاطمہؑ، زینبؑ

طلوعِ حرفِ اِقرا سے صدائے استغاثہ تک

حرا سے کربلا تک

مشیّت نے جو اِک خطِ جلی کھینچا ہوا ہے

اُسی کا نور ہے جو دل بہ دل منزل بہ منزل ہر طرف پھیلا ہوا ہے

رسالت کی گواہی ہو، ولایت کی گواہی ہو، امامت کی گواہی ہو

جو یہ کہہ دیں وہی میزانِ حق میں مستند مانا گیا ہے

خدیجہؑ، فاطمہؑ، زینبؑ

گواہی میں تسلسل اور پھر ایسا تسلسل

آپ خود اپنی جگہ اک معجزہ ہے

خدیجہؑ اور ابو طالبؑ نے جس منزل سے ناموسِ رسالتؐ کی

حفاظت کی یہ سارا معجزہ اس کی جزا ہے

یہ ہم جو آج بھی دنیا میں پہچانے گئے ہیں

لائقِ اکرام گردانے گئے ہیں

اُنھیں کے در کا صدقہ ہے اُنھیں کی سب عطا ہے

خدیجہؑ، فاطمہؑ، زینبؑ

عجب اک سلسلہ ہے

وفا کے باب میں، صدق و صفا کے باب میں

صبر و رضا کے باب میں

کیسا منور راستہ ہے

تعارف

میانِ خالق و مخلوق خطِ نور احمدؐ
محمدؐ خود جسے قرآن فرما دیں وہ قرآن
علیؑ وہ جن کے چہرے پر نظر کرنا عبادت
نبیؐ جن کے لیے تعظیم کو اٹھیں وہ زہراؑ
جوانانِ جناں کے سیّد و سردار حسنینؑ
شجاعت صبر کے پیکر میں ڈھل جائے تو زینبؑ
وفا امکان سے آگے نکل جائے تو عباسؑ

میانِ تیغ و سناں، لا الٰہ الاّ اللہ
حدیثِ شعلہ بجاں، لا الٰہ الاّ اللہ

مقامِ سجدۂ بے اختیار، عجز تمام
کمالِ حرفِ بیاں، لا الٰہ الاّ اللہ

جہاں رسولؐ کے نقشِ قدم وہیں پہ علیؑ
وہیں حسینؑ جہاں، لا الٰہ الاّ اللہ

ہر امتحان، ہر اک اِبتلا کی منزل میں
قرارِ دل زدگاں، لا الٰہ الاّ اللہ

شہود و شاہد و مشہود ایک ہوں کہ نہ ہوں
امین و امن و اماں، لا الٰہ الاّ اللہ

غبار اُڑاتے ہوئے وقت کے مقابل بھی
حصارِ نام و نشاں، لا الٰہ الاّ اللہ

سوالِ بیعت دربارِ شام اور حسینؑ
کہاں یزید، کہاں لا الٰہ الاّ اللہ

کنارِ آبِ رواں، ارتباطِ مشک و علَم
فغانِ تشنہ لباں، لا الٰہ الاّ اللہ

کربلا کی خاک پر کیا آدمی سجدے میں ہے
موت رُسوا ہو چکی ہے زندگی سجدے میں ہے

'وہ جو اِک سجدہ علیؑ کا بچ رہا تھا وقتِ فجر'
فاطمہؓ کا لال شاید اب اسی سجدے میں ہے

سُنتِ پیغمبرؐ خاتم ہے سجدے کا یہ طول
کل نبی سجدے میں تھے آج اِک ولی سجدے میں ہے

وہ جو عاشورہ کی شب گُل ہوگیا تھا اِک چراغ
اب قیامت تک اسی کی روشنی سجدے میں ہے

حشر تک جس کی قسم کھاتے رہیں گے اہلِ حق
ایک نفسِ مطمئن اُس دائمی سجدے میں ہے

نوکِ نیزہ پر بھی ہونی ہے تلاوت بعدِ عصر
مصحفِ ناطق تہِ خنجر ابھی سجدے میں ہے

اس پہ حیرت کیا لرز اٹھی زمینِ کربلا
راکبِ دوشِ پیمبرؐ آخری سجدے میں ہے
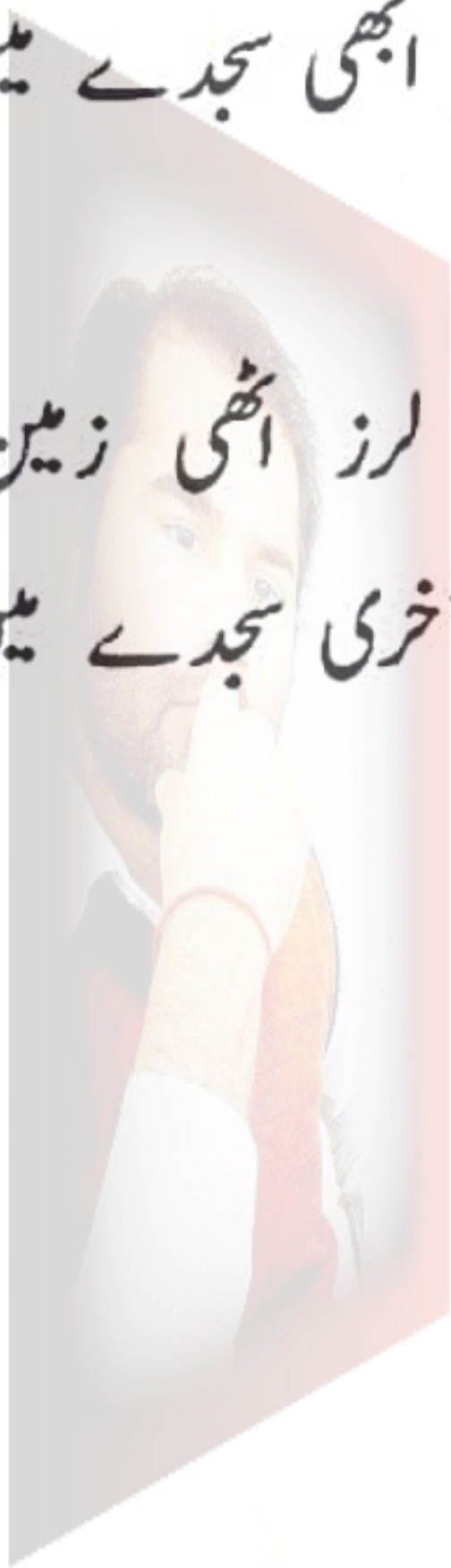
ابوذر غفاریؓ کے لیے ایک نظم

سلام اُن پر درود اُن پر
وہ کہہ رہے تھے
زمیں نے بوجھ ایسے آدمی کا نہیں اٹھایا جو تم سے سچا ہوا ے ابوذرؓ
وہ کہہ رہے تھے
فلک نے سایہ نہیں کیا ایسے آدمی پر جو تم سے سچا ہوا ے ابوذرؓ
سبھی یسار و یمین تصدیق کر رہے تھے
تمام اہلِ یقین تصدیق کر رہے تھے
سلام اُن پر درود اُن پر
مگر زمانے نے یہ بھی دیکھا
وہی مدینہ ہے اور ابوذرؓ ہیں اور منبر ہے اور منبر کا فیصلہ ہے

اور اب جو منبر کا فیصلہ ہے وہ قولِ صادقؑ سے مختلف ہے
جو قولِ صادقؑ سے مختلف ہے وہ فیصلہ میرے اور منبر کے درمیان
اک سوال بن کر ٹھہر گیا ہے
بہت زمانہ گزر گیا ہے مگر ابوذرؓ نگاہ میں ہیں
پھر کہیں گاہِ جبر زور آوروں کی سازش کے سارے منظر
نگاہ میں ہیں
دمشق و بغداد و قرطبہ کے سلاسلِ مصلحت کی بخشش
پہ پلنے والے تمام منبر نگاہ میں ہیں
جہانِ مظلوم خوابِ دیگر کا منتظر ہے
نیا زمانہ نئے ابوذرؓ کا منتظر ہے

اُسامہؓ ابنِ زیدؓ کے نام ایک نظم

پرچمِ جیشِ اُسامہؓ مرا اعزاز کہ میں
تیرے ناموس کو کرتا ہوں سلام

اک طرف سارے نجیب ابنِ نجیب ابنِ نجیب
اک طرف ایک غلام ابنِ غلام ابنِ غلام

حرمتِ حرفِ رسولؐ ایک طرف
جادۂ نخوتِ پارینہ کی اڑتی ہوئی دھول ایک طرف

اب بھی نخوت ہے وہی جبّہ و دستار کے بیچ
وہی معیارِ شرف دِرہم و دینار کے بیچ

اک غلام ابنِ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام
اب بھی نرغے میں ہے اک شہرِ دل آزار کے بیچ

نرغۂ اہل تکبّر سے نکالے مجھ کو
کوئی صدیقؓ نہیں ہے کہ بچالے مجھ کو

✡

ذکرِ مظلوم کو انعام میں رکھا گیا ہے
ظلم کو زُمرۂ دُشنام میں رکھا گیا ہے

از ازل تا بہ ابد سارے یزیدوں کا حساب
ایک ہی دفترِ بد نام میں رکھا گیا ہے

تا قیامت کسی ظالم کو نہ ہو جرأتِ ظلم
صبر کو منزلِ اقدام میں رکھا گیا ہے

کربلا ہو کہ نجف ہو کہ مدینہ سب کو
نور کے سلسلۂ عام میں رکھا گیا ہے

میں نے تقویمِ شہادت پہ نظر کی تو کُھلا
خاک کو شیشۂ ایام میں رکھا گیا ہے

صبر مخدومۂ کونین کی وارث زینبؑ
اِک نشانی کہ جسے شام میں رکھا گیا ہے

مفتخر ہوں تو یہ فیضانِ کرم ہے ان کا
اُن کی نسبت کو مرے نام میں رکھا گیا ہے
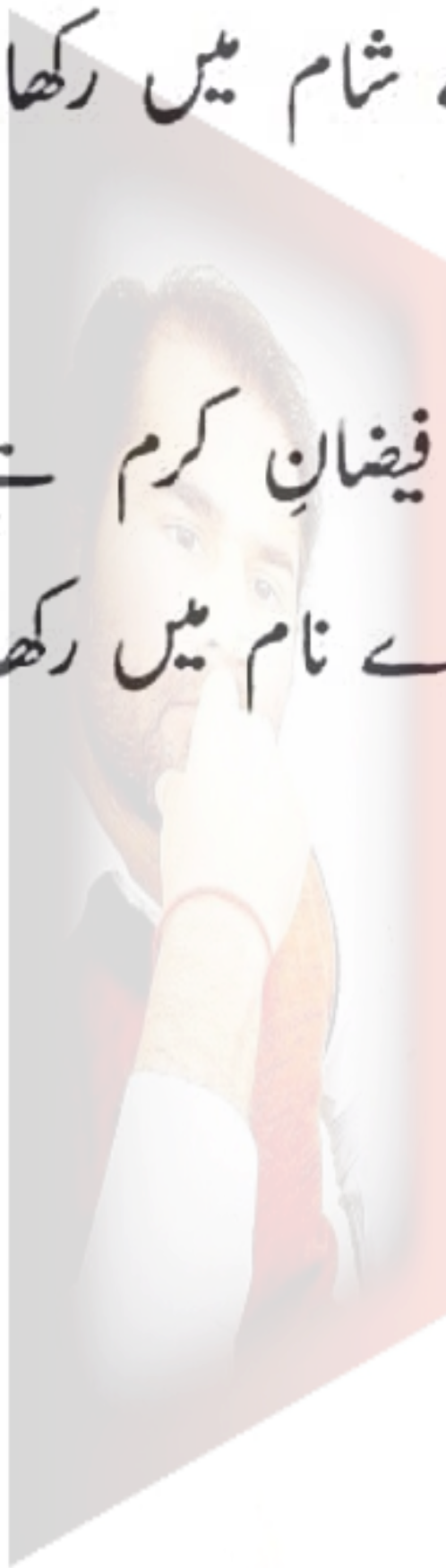
۞

حسینؑ! تم نہیں رہے تمھارا گھر نہیں رہا
مگر تمھارے بعد ظالموں کا ڈر نہیں رہا

مدینہ و نجف سے کربلا تک ایک سلسلہ
اِدھر جو آگیا وہ پھر اِدھر اُدھر نہیں رہا

صدائے استغاثۂ حسینؑ کے جواب میں
جو حرف بھی رقم ہوا وہ بے اثر نہیں رہا

صفیں جمیں تو کربلا میں بات کُھل کے آگئی
کوئی بھی حیلۂ نفاق کارگر نہیں رہا

بس ایک نام — اُنؐ کا نام اور اُنؐ کی نسبتیں
جز اُن کے پھر کسی کا دھیان عمر بھر نہیں رہا

کوئی بھی ہو کسی طرف کا ہو کسی نسب کا ہو
جو تم سے منحرف ہوا وہ معتبر نہیں رہا

اے زمینِ کربلا اے آسمانِ کربلا
تجھ کو یاد آتے تو ہوں گے رفتگانِ کربلا

کر رہے ہیں ذکر اُن کے حق کو پہچانے بغیر
سلسلے باطل کے اور زعمِ بیانِ کربلا

کچھ بریدہ بازوؤں والے نے لکھی ریت پر
کچھ کہانی کہہ گیا اک بے زبانِ کربلا

اپنے اپنے زاویے سے اپنے اپنے ڈھنگ سے
ایک عالم لکھ رہا ہے داستانِ کربلا

مصحفِ ناطق تلاوت کر رہا تھا وقتِ عصر
سن رہے تھے خاک پر آسودگانِ کربلا

ٹھوکروں میں ہے شکوہ و شوکتِ دربارِ شام
کوئی حُر کے دل سے پوچھے عزّ و شانِ کربلا

استغاثے کی صدا آئی ہے اُٹھو افتخارؔ!
استغاثہ، جس میں شامل ہے اذانِ کربلا
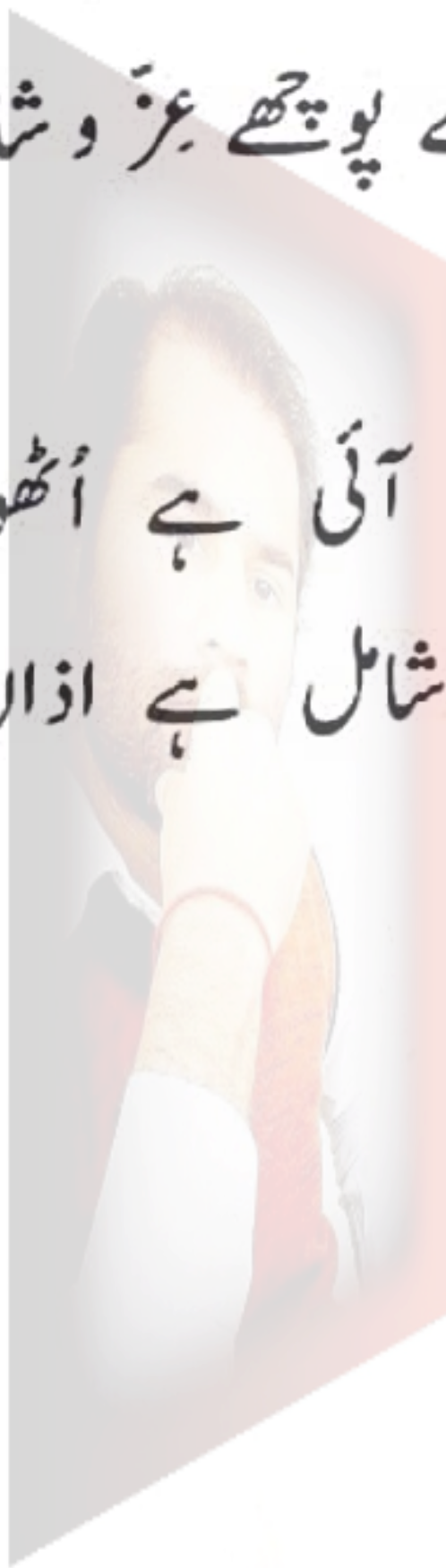
نمازِ عشق کی تفسیر بن گیا ترا غم
کبھی فغاں، کبھی سجدہ کبھی دُعا ترا غم

گروہِ خاک نشیناں کا آسرا ترا غم
بنا گیا ہے فقیروں کو کیا سے کیا ترا غم

ہزار ظلم کی کوشش کہ ذکر مٹ جائے
مگر بچھی تری فرشِ عزا، رہا ترا غم

حصارِ ظلم کے نرغے میں سرخ رُو ترے لوگ
حدودِ وقتِ معیّن سے ماورا ترا غم

مقابلِ صفِ اعدا بلند تیرے علَم
خیامِ صبر شعاراں کا حوصلہ ترا غم

کشاکشِ دل و دُنیا میں ہم غلاموں نے
ہر ایک چیز گنوا دی، بچا لیا ترا غم

ہوئی ہے جب بھی صف آرا سپاہِ ظلمت و ظلم
کہیں سپر، کہیں شمشیر، بن گیا ترا غم
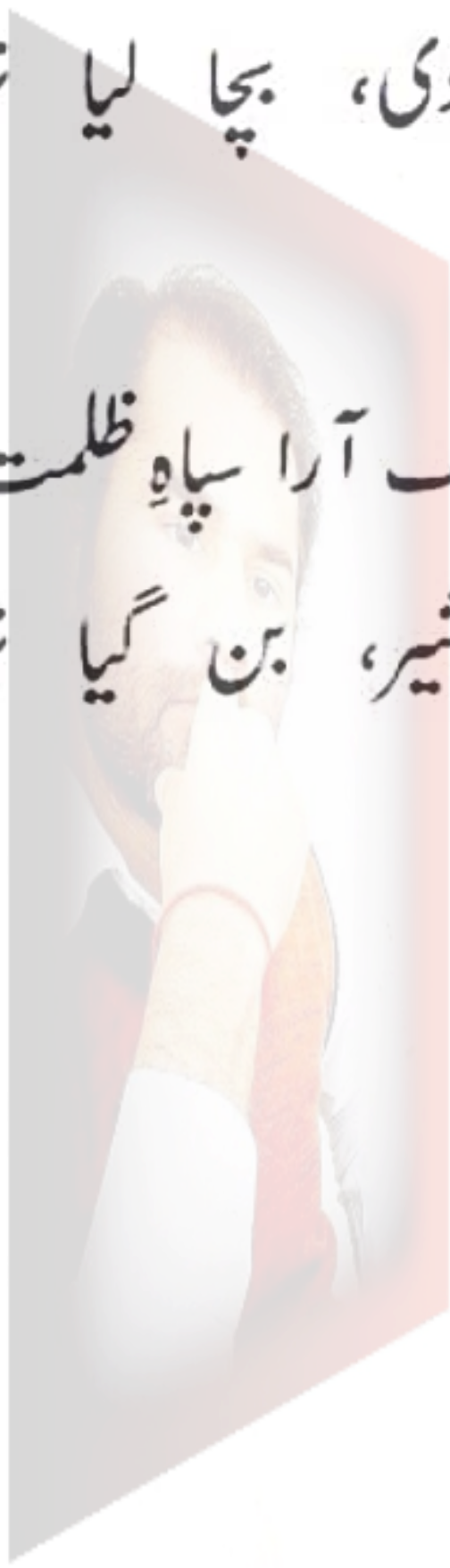
مظہرِ خوشنودیِ داور عَلَم عباسؑ کا
ایک دن لہرائے گا گھر گھر علم عباسؑ کا

کیسا لگتا ہوں میں جب کرتا ہوں مدحِ اہلِ بیت
کیسا لگتا ہے مرے سر پر عَلَم عباسؑ کا

ہم غلامانِ درِ مشکل کشا، مشکل کے وقت
چومتے ہیں یا علیؑ کہہ کر عَلَم عباسؑ کا

کون جانے روزِ عاشورہ فرازِ نور سے
دیکھتے ہوں فاتحِ خیبر عَلَم عباسؑ کا

اک پھریرا اک نشانِ خیر اک ننھی سی مشک
ہر دلِ مومن کو ازبر ہے عَلَم عباسؑ کا

کاش سن پاؤں کسی رہوار کے قدموں کی چاپ
دیکھ پاؤں خواب میں اکثر عَلَم عباسؑ کا

کون جانے آج اس جشنِ مبارک کے طفیل
سر پہ لہراتا رہے شب بھر عَلَم عباسؑ کا

آئینۂ انما حسنؑ ہیں
کیا جانے زمانہ کیا حسنؑ ہیں

اک صبر ہے فاطمہؑ کی میراث
اس صبر کا معجزہ حسنؑ ہیں

اک سمت علیؑ، حسینؑ اک سمت
اک حجتِ قائمہ، حسنؑ ہیں

اک بدر حسینؑ میں مجسم
اک صلحِ حدیبیہ حسنؑ ہیں

زینبؑ ہیں تتمۂ شہادت
دیباچۂ کربلا حسنؑ ہیں

نہ معجزہ ہے کربلا نہ حادثہ ہے کربلا
جو خون سے لکھا گیا وہ فیصلہ ہے کربلا

یہی نہیں کہ صرف اپنے عہد میں ہو، آج بھی
جہانِ مصلحت میں حرفِ برملا ہے کربلا

ہر ایک جبر کے خلاف خیر کے محاذ پر
جو مستقل بپا رہے وہ معرکہ ہے کربلا

مدینہ و نجف کی خاکِ پاک اور اس کے بعد
حسینؓ مرکزِ وفا ہیں — دائرہ ہے کربلا

سنان و خنجر و کمان، مشک و چادر و علَم
نشانیوں کا اِک عجیب سلسلہ ہے کربلا

صدائے استغاثہ

هَل مِن نَاصراً ینصُرنا
هَل مِن نَاصراً ینصُرنا

کیا کوئی ہے جو میری مدد کو پہنچے گا
کیا کوئی ہے جو میری مدد کو پہنچے گا

صدیوں پہلے دشتِ بلا میں ایک آواز سنائی دی تھی
جب میں بہت چھوٹا ہوتا تھا مجھ سے مری امی کہتی تھیں
یہ جو صفِ عزا بچھتی ہے اسی صدا کی بازگشت ہے
اسی صدا پر بستی بستی گریہ وزاری کا سامان کیا جاتا ہے

اور تجدیدِ بیعت نصرت کا اعلان کیا جاتا ہے

تب میں پہروں بیٹھ کے پیارے پیارے اچھے لوگوں کی باتیں سنتا تھا

سچے سچے لوگوں کی باتیں پڑھتا تھا اور پہروں روتا رہتا تھا

اور اب برسوں بیت گئے ہیں

جن کی آنکھوں میں آنسو تھے اب اُن کی آنکھوں میں حیرت ہے

سچائی کی گواہی دینے والے آخر ظالم کو ظالم کہنے سے ڈرتے کیوں ہیں

موت سے پہلے مرتے کیوں ہیں!

شامِ غریباں

دشتِ بلا میں لہو لہو لاتا دن گزرے گا شام آئے گی
شام آئے گی فاتحِ خیبرؑ کے بیٹوں کے لاشوں پر گھوڑے دوڑیں گے
شام آئے گی آلِ فاطمہؑ کے خیموں میں آگ لگے گی
شام آئے گی نیزوں پر قرآن اُٹھانے والے اب کے
صابر آلِ محمدؐ کا سر قلم کریں گے علم کریں گے

دشتِ بلا میں لہو لہو لاتا دن گزرے گا شام آئے گی
شام آئے گی سیّدہؑ عالمؑ کی بیٹی جلے ہوئے خیموں کے درمیاں سجدۂ شکر بجا لائے گی

مالک! سجدۂ شکر کہ میرا ماں جایا پیکانِ سہ شعبہ کھائے ہوئے بچے کے بعد بھی
مقتل میں سرشار رہا

سر دینے پر تیار رہا

ایفائے عہد کی منزل میں بیدار رہا

مالک! سجدۂ شکر کہ وہ کرّار تھا اور کرّار رہا

دشتِ بلا میں لہو رلاتا دن گزرے گا — شام آئے گی!

عہدِ امانت سر نوشت میں شامل تھا
بیعت سے انکار سرشت میں شامل تھا

آگ لیے جاتی تھی حُر کو اپنی طرف
ایک قدم اور اہلِ بہشت میں شامل تھا

وہ تو یہ کہیے میرے اشک مرے کام آئے
ورنہ میں بھی سنگ و خشت میں شامل تھا

نہ مال و زر ہے نہ جاہ و حشم ہمارا ہے
مگر خدا کی عطا ہے قلم ہمارا ہے

عَلم کسی نے کسی کو دیا تھا خیبر میں
وہ دن اور آج کا دن اب عَلم ہمارا ہے

قرآن حق ہے اور نبیؐ حق کے ساتھ ہے
جو ہے نبیؐ کے ساتھ وہی حق کے ساتھ ہے

فرمانِ پاک سیدِؐ والا یہ ہے کہ بس
جو ہے علیؑ کے ساتھ وہی حق کے ساتھ ہے

○

سند پہ مہرِ ختمی مرتبتؐ اے دل مبارک
غلامی علیِؑ مرتضیٰ کامل مبارک

مبارک باد دینے آئے ہیں سلمانؓ و بوذرؓ
قدم بوسی کو اُٹھ، ہم مشربوں سے مل، مبارک

یہ میرے لفظ جو کچھ آب و تاب رکھتے ہیں
کسی سے منزلتِ انتساب رکھتے ہیں

کتاب و سیرت و آلِ نبیؐ سے ہیں مربوط
کوئی بھی در ہو بہت اجتناب رکھتے ہیں

وہ ہم ہی ہیں کہ درِ شہرِ علم کے ہوتے
کوئی بھی در ہو بہت اجتناب رکھتے ہیں

وہ اور ہوں گے جو مشکل کشا کے ہوتے ہوئے
دلوں میں کشمکش و اضطراب رکھتے ہیں

زمانے بھر کی فتوحات، علیؑ کی اک ضربت
وہ اپنی جانیں ، ہم اپنا حساب رکھتے ہیں

کتابِ نور کبھی اُن پہ کھل نہیں سکتی
جو بُغضِ آلِ رسالت مآبؐ رکھتے ہیں

کسی بھی طرح کی محفل ہو، کوئی مجلس ہو
مرے امامؑ مجھے کامیاب رکھتے ہیں

ندیمِ دوست سے آتی ہو بوئے دوست جنھیں
وہ حقِ بندگیِ بُوترابؑ رکھتے ہیں

وارثِ احمدِ مختارؑ ہے آنے والا
نائبِ حیدرِ کرارؑ ہے آنے والا

جنسِ بازارِ معاصی ہیں مگر جانتے ہیں
اک ہمارا بھی خریدار ہے آنے والا
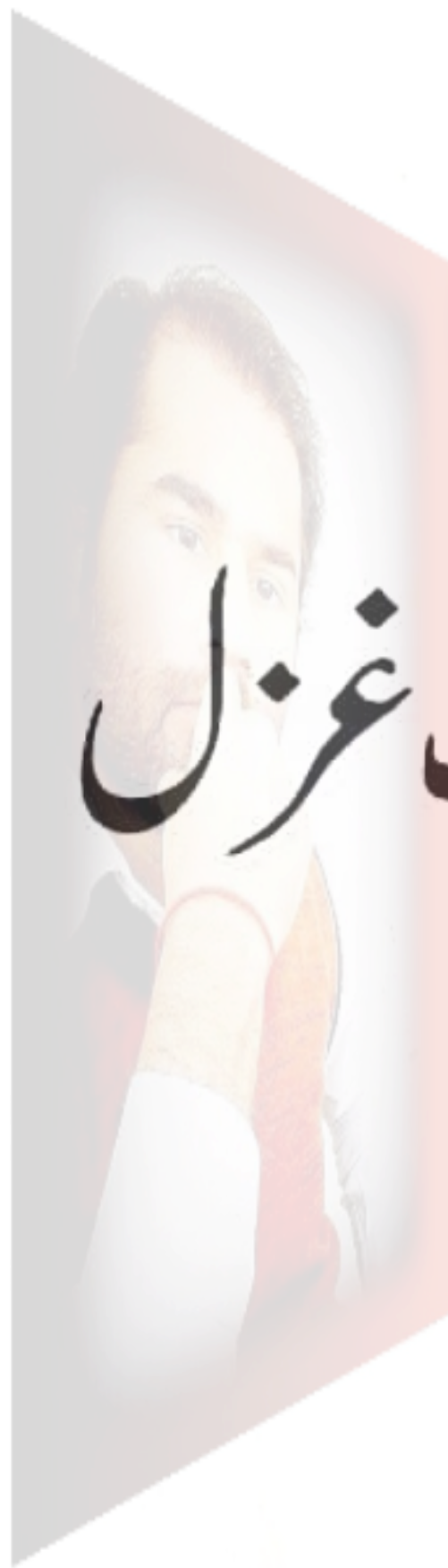
باب غزل

الحمد لائبریری
فیس بک
گروپ
کتابیں
پڑھیے
سید حسین احسن
Imagitor

فیض احمد فیض

پیش نامہ

آج کل ادبی حلقوں میں دو چار سوال اکثر سننے میں آتے ہیں:

کیا ہمارے شعر و ادب پر جمود طاری ہے؟

کیا وہ شاعری، جسے جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے، نثری نظم، آزاد نظم، تغزل سے عاری غزل وغیرہ وغیرہ ــــ اس جمود کا توڑ نہیں ہے؟

کیا نئے لکھنے والوں میں کوئی ہونہار بروا ایسا نہیں ہے جس کے چکنے پتوں سے کچھ اُمید وابستہ کی جا سکے؟

افتخار عارف کا پہلا دیوان دوبار پڑھنے کے بعد مجھے یہی محسوس ہوا کہ اس کے اوراق میں کلّی طور سے نہیں تو جزوی طور سے ان سوالات کا جواب موجود ہے۔ اور یہ غالب کی طرف داری اس لیے نہیں ہے کہ افتخار عارف سے یوں تو کافی دنوں سے یاد اللہ ہے لیکن اب تک ہم صرف اُن کے ٹی وی کمالات سے واقف تھے، اُن کے کلام سے محظوظ ہونے کا پہلی بار اتفاق ہوا ہے۔

تو پہلے جمود اور حرکت کے مسئلے پر غور فرمائیے:

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ محض روایات کی لکیر پیٹتے رہنے سے شعر و ادب کی گاڑی آگے نہیں چلتی۔ لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اگر باکمال سخنور اس سے ذرا ہٹ کر کسی پرانے

ڈیزائن پر نئے نئے بیل بوٹے بناتے رہیں یا کسی ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھتے رہیں تو ان کاوشوں سے اچھا ادب ضرور تخلیق ہو سکتا ہے لیکن آنے والوں کے لیے کوئی نیا رستہ نہیں کھلتا۔ اس کے برعکس یوں بھی ہے کہ جیسے ڈیڑھ اینٹ سے کوئی مسجد نہیں بنتی، اسی طرح کسی ایسے ڈیڑھ ادیب سے کوئی تحریک بھی نہیں چلتی جن کا کلام وہ خود یا اُن کے دو چار احباب سمجھیں، جو ادب کے عام شائقین سے خطاب کرنے کے بجائے اپنی اپنی ٹولی میں ''من ترا حاجی بگویم'' کی گردان کرتے رہیں۔ جنگل میں کتنے ہی مور ناچا کریں، تماشائیوں کو اس سے کیا مطلب۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح کسی ایک ہی مضمون کی مکھی پر مکھی مارنے کو مضمون آفرینی نہیں کہتے، اسی طرح بھینس کے انڈے سے روغنِ گل نکالنا بھی کسی ندرت یا جدّت کا ثبوت نہیں ہے۔ اس نوع کی جدّت اور فنی یا تخلیقی ایجاد و اختراع میں وہی فرق ہے جو موسیقی کی اصطلاح میں اُپج اور بے سرے پن میں فرق ہے۔ یا دینی اصطلاح میں اجتہاد اور بدعت میں فرق ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ جیسے قانونی قاعدہ ہے کہ صحیح انصاف کے لیے لازم ہے کہ وہ نہ صرف منصفانہ ہو بلکہ منصفانہ نظر بھی آئے۔ اسی طور سے کسی بھی شاعرانہ تجربے کے لیے لازم ہے کہ وہ نہ صرف شاعرانہ ہو بلکہ اس کی شعریت اُجاگر بھی دکھائی دے۔

اور آخری بات یہ ہے کہ اپنے من میں ڈوب کر صوفی کو تو شاید زندگی کا سُراغ مل سکے لیکن ادیب یا شاعر کو یہ سراغ لگانے کے لیے اپنے من ہی میں نہیں، اپنی ہم عصر انسانی برادری کے مَن میں بھی ڈوبنا پڑتا ہے۔ اسے یہ جوہر ودیعت ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ کم نگہ اس کی آنکھوں سے نیک و بد کو پہچان سکیں، اور کج مج زبان اس کی زبان سے اپنے درد و کرب، غیظ و غضب، یا امید و طرب کا اظہار کر سکیں۔ ان بیان کردہ نکات میں آپ کسی کو بھی کسوٹی ٹھہرا لیں، افتخار عارف کی بہت سی تحریریں اس پر پوری اُتریں گی۔

انگریزی زبان کی ایک کہاوت اپنے الفاظ میں یوں ہے کہ ایک پرندے کے چہچہانے سے آمدِ بہار کا سامان پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اپنی جگہ، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ گلزارِ سخن کو کوئی نیا خوش نوا کسی نئے دبستان کے کھل جانے کا امکان بھی بہم پہنچا دیتا ہے۔ اور اس کی

پہچان یہی ہے کہ اس کے نطق و قلم نے شعر کے اجزائے ترکیبی یعنی لَے اور آہنگ، لُغت Diction اور محاورہ Imagination، مضامین و مطالب میں کوئی ایسی بات پیدا کی ہے یا نہیں جو اس کے معاصرین کو متاثر اور مشتعل کر سکے — کوئی ایسی طرزِ فغان، جسے چمن والے مل کر لوٹ سکیں۔ اپنی رائے یہ ہے کہ افتخار عارف کے کلام میں یہ سبھی جھلکیاں موجود ہیں۔

جب یہ کہا گیا تھا کہ فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے تو بعض نثری نظم کہنے والے اس کا غلط مطلب سمجھ بیٹھے۔ مراد یہ نہیں تھی کہ نظم کو نثر بنانے کے لیے کسی لے، کسی آہنگ، کسی وزن کی حاجت ہی نہیں ہے، مُراد یہ تھی کہ فریاد یا شعر کی کوئی ایک لَے نہیں ہے بلکہ رُسوماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں۔ یعنی موزوں شعر کے لیے مروّجہ عروض ہی وزن کا ایک پیمانہ نہیں ہے، وزن برقرار رکھنے کی اور صورتیں بھی ہیں۔ اس کی ایک دلیل تو یہی ہے کہ اگر چہ ہم نے وزن کا پیمانہ تو وہی ٹھہرا رکھا ہے جو عربی عروض کا ہے لیکن نہ تو عربی زبان کی بہت سی بحور کو موزوں طریقے سے ادا کر سکتے ہیں نہ ہماری بعض مروّجہ بحروں کا عربی عروض میں کہیں وجود ہے۔ ہوا یہ ہے کہ پہلے فارسی والوں نے اپنے مزاج کے مطابق عربی بحور میں کتر بیونت کر کے ان ترامیم کو زحافات کا نام دے کر سند بنالیا۔ اور پھر قلی قطب شاہ سے لے کر میر صاحب اور نظیر اکبر آبادی تک ہمارے ہاں بھی ان میں کچھ ترمیم و اضافہ ہوتا رہا۔ بزرگ تُرکی شاعر ناظم حکمت نے ایک گفتگو میں ہم سے کہا تھا کہ روزمرّہ بول چال میں بھی ایک آہنگ یا Rythm ہوتا ہے لیکن اسے دریافت کرنے اور تحریر میں لانے کے لیے بہت حساس کان چاہییں۔

بہر صورت یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ لے یا تال یا آہنگ کا رشتہ بنیادی طور سے حروف کے ساتھ نہیں اصوات سے ہے۔ اس لیے اگر کوئی منظوم، کان کو الفاظ کی صوتی ترتیب اور تکرار و تنوع کے سبب موزوں اور مترنم لگے تو اُسے تقطیع کے ڈھانچوں میں فِٹ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ افتخار عارف نے یوں تو سبھی نسخے استعمال کیے ہیں، کہیں عروض کی پوری پابندی کی ہے — جیسے ''میلہ''، ''بارہواں کھلاڑی'' وغیرہ میں، کہیں اس سے ہٹ کر لکھا ہے:

گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندی ہوئی روشنی
دریا سے مقتل تک پھیلی ہوئی روشنی

جلے ہوئے خیموں میں سہمی ہوئی روشنی
سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں

یا — پتنگیں لوٹنے والوں کو کیا معلوم، کس کے ہاتھ کا مانجھا کھرا تھا اور کس کی ڈور ہلکی تھی۔ لیکن کہیں بھی لَے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، چنانچہ ان کی کسی بھی نظم پر نثری نظم کا دھوکا نہیں ہوتا کہ نظم شعر کی سطحِ مرتفع سے اُتر کر نثر کے سپاٹ میدان میں اُتر آئی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ بعض مختصر نظموں میں اگر مضمون ہلکا ہے تو یہ سطح کچھ زیادہ اُوپر نہیں اُٹھ سکی۔

اِفتخار عارف کے کلام میں میر و غالب سے لے کر فراق و راشد تک سبھی کی جھلکیاں موجود ہیں لیکن آپ نے ان بزرگوں سے استفادہ کیا ہے، کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی بلکہ لَے اور آہنگ کی طرح کچھ ایسا ہی اجتہاد لُغت اور محاورے میں بھی کیا ہے۔ موضوع کی رعایت سے کہیں کلاسیکی اور ادبی زبان کے شکوہ سے کام لیا ہے تو کہیں روزمرہ کی بولی ٹھولی کو شعریت سے پیوند کیا ہے، حتّٰی کہ غزل جیسی کافر صنف میں بھی کچھ انفرادی برھت کی ہے۔ آج کل غزل سے جو دراز دستیاں کی جا رہی ہیں اُن پر توجہ دینے کے بجائے غزل کے سبھی تلازمے برقرار رکھے ہیں۔ لیکن نہ چلتی ہوئی بحروں کا سہارا لیا ہے، نہ روندی ہوئی زمینوں پر انحصار کیا ہے، نہ لفظی چٹخاروں سے داد وصول کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بدل میں کم مستعمل بحریں استعمال کی ہیں اور نفسِ مطالب کو قافیہ بند کرنے کے بجائے غیر متوقع اور برمحل سلیقے سے شعر کو جگمگا دیا ہے:

اس بار بھی دُنیا نے ہدف ہم کو بنایا
اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے

بیچ آئے سرِ قریۂ زر جوہرِ پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اُتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

حبسِ شب ہو تو اُجالے بھی ترے شہر سے آئیں
خواب دیکھوں تو حوالے بھی ترے شہر سے آئیں
تیرے ہی شہر میں سر تن سے جدا ہو جائے
خوں بہا مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں
بات تو جب ہے کہ اے گریہ کنِ حرمتِ حرف
مدحِ قاتل میں مقالے بھی ترے شہر سے آئیں

پھر جدید مضامین و مطالب کی ادائیگی میں روایت کے خزینے سے یوں کسبِ فیض کیا ہے کہ تلمیح کو علامت اور علامت کو استعارے کا رُوپ دے کر نظم اور غزل دونوں کے لیے رمز و کنایہ کا نیا سامان پیدا کیا ہے۔ اس ضمن میں اب سے پہلے عشق و طلب، ایثار و جاں فروشی، جبر و تعدّی کا بیان صرف منصور و قیس، اور فرہاد و جم کے حوالے سے کیا جاتا تھا۔ پھر جب گھر میں دار و رسن کی بات چلی تو مسیح و صلیب کے حوالے بھی آ گئے لیکن المیۂ کربلا اور اس کے محترم کرداروں کا ذکر بیشتر سلام اور مرثیے تک محدود رہا۔ صرف علامہ اقبالؒ کی نگہ وہاں تک پہنچی:

خونِ حسینؓ بازدہ کوفہ و شام خویش را

یا —

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں

اِفتخار عارف نے گذارشِ احوالِ واقعی کے لیے اس ماخذ سے بہت اثر آفریں اور خیال افروز کام لیا ہے:

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں

وہی پیاس ہے، وہی دشت ہے، وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

صبح سویرے رَن پڑنا ہے اور گھمسان کا رَن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوکِ سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

میں جانتا تھا مرے قبیلے کی خیمہ گاہیں جلائی جائیں گی اور تماشائی
رقصِ شعلہ فشاں پہ اصرار ہی کریں گے
میں جانتا تھا مرا قبیلہ بریدہ و بے ردا سروں کی گواہیاں لے کے آئے گا
پھر بھی لوگ انکار ہی کریں گے
گزارشِ احوالِ واقعی کے سلسلے میں ظلم و تعدّی، جبر و زباں بندی کی شرح یوں کی ہے:
مصاحبینِ شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوؤں سمیت
شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں
اور ہر طرف سکون ہے
خلیجِ اقتدار سرکشوں سے پاٹ دی گئی
جو ہاتھ آئی دولتِ غنیم بانٹ دی گئی
طنابِ خیمۂ لسان و لفظ کاٹ دی گئی
فضا وہ ہے کہ آرزوئے خیر تک جنون ہے
سکون ہی سکون ہے

شاخِ زیتون پر کم سخن فاختاؤں کے اتنے بسیرے اُجاڑے گئے
اور ہوا چُپ رہی
بے کراں آسمانوں کی پہنائیاں بے نشیمن شکستہ پروں کی تگ و تاز پر

بین کرتی رہیں اور ہوا چپ رہی۔

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دُعا نہ مانگے کوئی
کھلا جو روزنِ زنداں تو تیر آنے لگے
اب ان فضاؤں میں تازہ ہوا نہ مانگے کوئی

دوسرا مضمون تنہا فرد کی بے کسی اور بے بسی کا بھی ہے اور حرف سے نبرد آزما ہونے کی طلب اور تمنا کا بھی:

چھوٹے چھوٹے فرعونوں کا اک لشکر
اور ایک اکیلا میں، میرے ہاتھ عصا سے خالی

میں اکیلا آدمی کیسے لڑوں
میں نہتا آدمی کیسے لڑوں

میں لاکھ بزدل سہی مگر میں اُسی قبیلے کا آدمی ہوں کہ جس کے بیٹوں نے
جو کہا اُس پہ جان دے دی.....
اور اب مجھے میرے شہسواروں کا خون آواز دے رہا ہے
تو نذرِ سر لے کے آ گیا ہوں

میں پا برہنہ سرِ کوچۂ احتیاج
رِزق کی مصلحت کا اسیر آدمی
دیکھتا رہ گیا، سوچتا رہ گیا
جسم میں میرے اُن کا لہو ہے تو پھر یہ لہو بولتا کیوں نہیں

تیسرا مضمون رزق کی مصلحت کے اسیروں کی محتاجی اور تن آسانی کا بھی ہے اور اس تذلیل سے سرکشی کا بھی:

ابھی اُٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دستِ کرم
کہ سارا شہر لیے کاسۂ طلب نکلا!

قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو خیالِ بال و پر شاید نہ آئے

روز اِک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے

پتھر پہ سر رکھ کر سونے والے دیکھے
ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

اور آخر میں بظاہر غیر مختتم انتظارِ نجات:

ہم اہلِ انتظار کتنے بدنصیب لوگ ہیں

غمِ جہاں کو شرمسار کرنے والے کیا ہوئے
وہ ساری عمر انتظار کرنے والے کیا ہوئے
کہاں ہیں وہ جو دشتِ آرزو میں خاک ہوگئے
وہ لحۂ ابد شکار کرنے والے کیا ہوئے

یہاں اس شرحِ احوال کا سیاسی تجزیہ مقصود نہیں۔ اس نظر سے دیکھیں تو اختلاف کی بہت کچھ گنجائش بھی نکل سکتی ہے، مثلاً کہہ سکتے ہیں کہ یہ حقیقتِ حال کی تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ اس میں اعترافِ شکست زیادہ ہے، دعوتِ ہل من مبارز کم، انفعال زیادہ ہے،

اشتعال کم، حزن و یاس کی پرچھائیاں زیادہ ہیں، امید و رجا کی جھلکیاں کم ہیں۔ دکھوں کی نشاندہی کی ہے، چارہ گری کا نسخہ نہیں بتلایا۔ تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ تصویر کا یہ رخ بھی حقیقتِ حال کا ہی ایک رُخ ہے اور اس کا بیان بجائے خود احتجاج کا لہجہ ہے۔

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد غالباً آخری سوال کا جواب ضروری نہیں ہے جو مستقبل کے بارے میں اُٹھایا گیا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کسی مصنف کا مقام یا اس کی تصنیف کی قدر و قیمت مستقبل سے قطعِ نظر، اُسی وقت متعین ہو جانی چاہیے جب وہ ظہور میں آئے، چنانچہ افتخار عارف، بڑے ہو کر کیا کریں گے یا نہیں کریں گے، یہ موسیقی کی اصطلاح میں اُن کے ریاض پر ہے، اگر کچھ نہیں کریں گے تو یہ اُن کی نالائقی ہوگی لیکن وہ اور کچھ نہ بھی کریں تو بھی یہ کتاب جدید ادب میں انھیں ایک معتبر مقام دلوانے کے لیے بہت کافی ہے۔

انتظار حسین

افتخار عارف — ایک تاثر

افتخار عارف کا نام ہم نے سب سے پہلے پی ٹی وی کے ایک مقبول پروگرام ''کسوٹی'' کے حوالے سے سنا تھا، نام کے ساتھ چہرہ بھی دیکھا، وہ نام چندے خوب چلا، خوب چمکا مگر جلدی ہی وہ چہرہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور نام پردۂ اخفا میں چلا گیا اچھا ہی ہوا۔ زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ وہ حوالہ بھی اب یاروں کو کم کم یاد ہے، اب یاد بھی آتا ہے تو اس طرح جیسے بڑے ہو کر شریف آدمی کو بھی کبھی اپنے لڑکپن کی غلط کاریاں یاد آ جاتی ہیں، مگر آدمی کو غلط کاریوں سے مفر تو نہیں۔ اچھا یہ ہے کہ لڑکپن ہی میں آدمی یہ کام کر لے اور آگے گزر جائے، سو افتخار عارف نے لڑکپن میں یہ کام کیا اور اس طرح کہ چاند چڑھے کُل عالم دیکھے۔ پھر شتابی سے فارغ ہوئے اور لندن چلے گئے، وہاں اُردو مرکز میں جا براجے۔ وہاں کچھ اردو کی خدمت کی کچھ یاروں کی، مگر جہاں یار ہوں گے وہاں اغیار بھی ہوں گے، تو لندن سے اُنھوں نے جو کمائی کی اس میں دونوں ایسے کتنے نگ انھیں میسر آئے، پھر جس گھوڑے پہ سوار تھے وہ گھوڑا ہی ختم ہو گیا۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

بی سی سی آئی ہی کا بستر لپٹ گیا۔ جہاں اتنا کچھ گیا وہاں اردو مرکز بھی گیا۔ افتخار عارف کپڑے جھاڑ کر وہاں سے نکلے، پھر واپس پاکستان میں، کچھ وقت مقتدرہ قومی زبان میں

گزارا، اب اکیڈمی آف لیٹرز میں براجتے ہیں۔

افتخار عارف سے علیک سلیک تو پہلے بھی تھی مگر ان سے ملاقات اصل میں لندن میں ہوئی۔ وہاں میں رسمی طور پر اُردو مرکز کا مہمان تھا، اصل میں مہمان تھا افتخار عارف کا، سو جلدی ہی بستر بوریا ہوٹل سے اٹھایا اور ان کے گھر آ کے پسر گیا۔ تب پتا چلا کہ یہ لکھنؤ کا دانہ ہے کہ لندن میں آ کر گل و گلزار بن گیا ہے۔ خیر لکھنؤ سے تو اور کتنے دانے لڑھک کر پاکستان آئے تھے، اب وہ پہچاننے میں نہیں آتے، اہلِ زبان ہیں مگر زبان انھیں غچا دے گئی۔ تو اب جیسے ہم ایسے ہما شما ویسے وہ لکھنؤ والے۔ تو اُن کے طفیل ہوا یہ کہ مجھ پہ جو لکھنؤ کا رُعب تھا بلکہ رعاب شعاب تھا وہ اُٹھ گیا، مگر اب جب افتخار عارف نے اپنے شہر کی شخصیتوں کے حوالے دینے شروع کیے اور بتانا شروع کیا کہ انھوں نے کیسے کیسے مجتہد، کیسے کیسے شاعر کی آنکھیں دیکھی ہیں، کس کی دیوار سے ان کے گھر کی دیوار ملی ہوئی تھی، کس سے ان کی دانت کاٹی تھی، کیسے کیسے علامہ سے انھوں نے اپنے شعر پر داد لی تھی، اور کس کی زبان پر انھوں نے بصد ادب نوکا تھا تو لگا کہ جس رعب سے ہم نکل آئے تھے وہ بحال ہونے لگا ہے۔ اب دیکھیے میں تو قصباتی مخلوق ہوں، انیس اور سرشار کے شہر سے جو آ رہا ہو اس کے مقابلے میں، میں ایسے حوالے کہاں سے لاتا۔ ابھی میں نے ان کا ایک انٹرویو پڑھا ہے جس میں ایسی ایسی شخصیتوں کے حوالے ہیں اور ان سے ان کا ربط و ضبط کہ میرے احساسِ کمتری میں ایک دم سے کتنا اضافہ ہو گیا۔

ویسے اب افتخار عارف کو حوالوں کی ضرورت نہیں ہے وہ خود حوالہ بن چکے ہیں۔

اصل میں، میں نے جو لکھنؤ کے سلسلہ میں حوالہ دیا ہے اس کی ایک وجہ ہے، اردو یوں تو ہم سب ہی بولتے اور لکھتے ہیں، مجھ جیسا قصباتی آدمی بھی اس میں ٹوں ٹاں کر لیتا ہے لیکن لکھنؤ میں پہنچ کر اس زبان نے کچھ اور ہی شان سے رنگ پکڑا تھا، لکھنؤ والوں نے اس کے لہجوں کو اتنا بنایا سنوارا، اتنا مانجھا، اتنی شائستگی پیدا کی کہ یہ زبان وہاں اچھی خاصی ایک تہذیب بن گئی۔ یوں تہذیب کسی زبان کا کرشمہ نہیں ہوتی ہاں دوسرے کرشموں کے ساتھ مل کر اپنا کرشمہ دکھاتی ہے، مگر کسی کسی گروہ کے ہاتھوں میں آ کر اتنی بن سنور جاتی ہے کہ وہ خود ایک تہذیب بن جاتی ہے۔ لکھنؤ اپنی جگہ ایک تہذیب تھا، اس نے اردو کو اپنے رنگ میں رنگ کر

اپنی چہار دیواری میں ایک تہذیب بنالیا۔ اب جن شخصیتوں کا حوالہ افتخار عارف دیتے ہیں اُن کا علم و فضل، ان کا ادبی مقام، ان کی شاعرانہ حیثیت اپنی جگہ، میں جس بات سے مرعوب ہوتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان میں ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن میں وہ تہذیب بولتی ہے۔ میں نے ان شخصیتوں کو نہیں دیکھا، جانے وہ کیسے ہوں گے مگر افتخار عارف کو تو دیکھ رہا ہوں، اور واقعی کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک شخص سے نہیں مل رہا، ایک تہذیب سے مل رہا ہوں۔

دوست تو میرے اور بھی ہیں، جن سے گاڑھی چھنتی تھی، ان میں سے کتنے اللہ کو پیارے ہوگئے، جو رہ گئے ہیں ان سے ملاقات کو غنیمت جانتا ہوں مگر افتخار عارف سے ملاقات میں کچھ الگ قسم کا ذائقہ ہے، یہ ایک تہذیب کا ذائقہ ہے، ذائقہ جس کے لیے میں ترستا ہوں وہ یہاں مجھے اس صحبت میں میسر آتا ہے۔

وہی تہذیب جس کا ذائقہ افتخار عارف کی شخصیت میں سمویا ہوا ہے، مجھے لگتا ہے کہ ان کی شاعری میں بھی سرایت کر گیا ہے، بلکہ یوں لگتا ہے کہ یہ جو انھوں نے عقیدتی شاعری کی ہے وہ رسمی نعت، منقبت اور مرثیے سے ہٹ کر خود ایک تہذیب بن گئی ہے، راستہ اس کا بھی لکھنؤ سے ہو کر جاتا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ واقعۂ کربلا کی یاد تو اس برصغیر کے قریے قریے میں منائی جاتی ہے، ذوالجناح اور تعزیے کے جلوس بھی نکلتے ہیں، مجالس بھی ہوتی ہیں اور نوحہ، مرثیہ بھی ہوتا ہے مگر لکھنؤ نے جس طرح واقعۂ کربلا کی یاد کو ایک تہذیب کے سانچے میں ڈھالا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، یہ بیان تفصیل چاہتا ہے، اس وقت میں اس تفصیل میں تو نہیں جا سکتا مگر انیس کا ایک شعر سن لیجیے:

صندل سے مانگ، بچوں سے گودی بھری رہے
یارب، رسولِ پاکؐ کی کھیتی ہری رہے

یہ ایک بولتا ہوا نقشہ ہے جہاں لکھنؤ اور کربلا ایک دوسرے میں گھل مل کر ایک تہذیب بن گئے ہیں۔

افتخار عارف کی عقیدتی شاعری کی تہ میں یہی تہذیب رچی بسی ہے مگر ایک فرق کے ساتھ۔ اصل میں انیس کے بعد ہماری عقیدتی شاعری کی روایت میں ایک اور واقعہ گزر گیا، وہ واقعہ ہے اقبالؔ کا ظہور۔ اقبال نے انیس کے شعری بیان سے گزر کر واقعۂ کربلا کو ایک

اور سطح پر جا کر علامتی رنگ میں برتا اور اس کا رشتہ ہمارے زمانے کے ساتھ قائم کر دیا، تو اب انیس اور افتخار عارف کے درمیان اقبال حائل ہے اور جب ایک بڑا شاعر اسی میدان میں ظاہر ہو جائے جس میں ایک بڑا شاعر گزر چکا ہو تو پھر وہ کسی بعد میں آنے والے باشعور شاعر کو پچھلے کی طرف جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اب اگر آج کا کوئی شاعر اقبال سے کنی کاٹ کر انیس سے رجوع کرتا ہے تو پھر وہ مجلسوں میں پڑھا جانے والا مرثیہ لکھے گا اور امام بارگاہ سے باہر نہیں آ سکے گا۔ افتخار عارف کی عقیدتی شاعری نے انیس کو ہضم کرنے کے بعد اس شعور سے رشتہ جوڑا ہے جس نے اقبال کی عقیدتی شاعری کے ساتھ ظہور کیا تھا۔ سو وہ ہمارے زمانے کی صورتِ حال کے ساتھ بھی پیوست ہے اور جو انھوں نے سیکولر روایت میں شاعری کی ہے اس کے ساتھ بھی ہم رشتہ ہے۔ مگر لیجیے یہ تو میں افتخار عارف کی شاعری کی طرف نکل آیا، اس طرف آنا تو مقصود ہی نہیں تھا۔ سو میں اس بیان کو یہیں روکتا ہوں اور آپ سے رخصت کی اجازت چاہتا ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی

کچھ غزل اور افتخار عارف کے بارے میں

غزل ایک صنفِ سخن ہی نہیں بلکہ ہمارا پیرایۂ اظہار اور ثقافتی نسب نامہ بھی ہے۔ اس نسب نامے میں ہمارے ماضی، حال اور مستقبل کے امکانات اور شرف کے نشانات موجود ہیں۔ غزل نے ہمارے اظہار کے امکانات کی خبر ہمیں دی ہے۔ کوئی بھی صنفِ سخن ہو جب ہمیں اپنے امکانات کی خبر دیتی ہے تو غزل کے لہجے میں گفتگو کرتی ہے:

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

جانے میں رسولوں کی دعا، آنے میں تاثیر
بن جانے میں تدبیر، بگڑ جانے میں تقدیر

جانے اُس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

کون ستارے چھو سکتا ہے
راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

اور جوش صاحب کی نظمیں تو غزل مسلسل ہیں۔ تو کیا میں نے غلط کہا کہ غزل ہمارا پیرایۂ اظہار اور لبِ گفتار ہے۔

برہنہ گفتاری اور برہنہ گوئی کے اس دور میں ایسے صاحبِ گفتار موجود ہیں جو اس جمالِ پردہ دار کے محرمِ اسرار ہیں جس کو غزل کہتے ہیں۔ غزل جو وقت کے غسلِ آتشیں کے ذریعے سہاگن بنی۔ اردو کے روایت شکن شاعر میرا جی کے خیال کے مطابق ہماری تہذیب کی دو سدا سہاگنیں ہیں: ایک اردو غزل اور دوسری میر جی کا شہر دلّی۔ اُن منتخب برگزیدہ آوازوں میں افتخار عارف بھی شامل ہیں۔ ان کی غزل ہماری روایات کا احاطہ کرتی ہے، ان کے دور کا بھی اور ان کی ذات کا بھی۔ غزل کہنے، غزل کو سمجھنے کے لیے نہایت مہذب اور تہذیب یافتہ شخصیت کی ضرورت ہے۔ وہ شخصیت اور ذہن جو کائنات کی ہر شے میں زیریں لہر کی طرح موجود ربط اور رشتے کو سمجھ سکے، جسے یہ خبر ہو کہ:

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

غزل کی ''بزمِ انجم'' کا ہر ستارہ دوسرے سے الگ نظر آتا ہے لیکن ان کا ربطِ باہم فکر اور احساس کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ بڑے اور قابلِ توجہ غزل گو کی ایک فکری دنیا ہوتی ہے جس کو تربیت یافتہ قاری سمجھتا ہے۔ میر کی اس کارگہِ شیشہ گراں میں فرد کی فردیت اور کائنات سے اس کے تعلق کے شواہد نمایاں ہیں۔ آتش کے ہاں ایک ایسی روحانیت ہے جس میں حرکت بھی ہے اور جو زندگی کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کی قوت انسان کے مرتبے کا اعلان ہے، غالب نے تمنائے دیدن اور تقاضائے چیدن کو بلند تر کر کے کائناتی سطح تک پہنچا دیا، یگانہ کی ہمت اور حوصلہ مندی نے نعروں کو بہت پیچھے چھوڑ کر غزل کو ایک نئے آہنگ کا امین بنایا اور اقبال کی غزل تو فراق کے الفاظ میں حیات و کائنات کا ایک ہمہ گیر اور کُل شناس آئینہ ہے۔

ان سب اور کچھ دوسری آوازوں نے افتخار عارف کو آدابِ سخن سکھائے ہیں۔ اس پر اضافہ کیجیے اُس فضا کا اور اس ماحول کا جس میں افتخار عارف نے اپنے شعور کی آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے لکھنوی تہذیب کی شامِ غریباں بھی دیکھی ہے اور عہدِ نو کی صبح بھی:

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز
مجھ پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

اپنے نئے وطن میں جو اُن کی ارضِ موعودہ تھا، افتخار عارف کا برق سامان حافظہ اور عالمی مسائل کی معلومات کا دائرہ، ان کے تعارف کا وسیلہ ہے لیکن افتخار عارف معلومات کو علم میں بدلنے کے پروسس سے ایک لمحے کے لیے غافل نہیں رہے اور یہی علم ان کی شاعری کی اساس بنا۔ شعر صرف معاملاتِ دل کا نام نہیں بلکہ یہ عرفانِ حیات اور تفہیمِ کائنات کے مرحلوں تک رسائی سے عبارت ہے، اور اس مہم میں آدمی کو اپنے آپ کو اور الفاظ کو فتح کرنے کا ہنر سیکھنا پڑتا ہے۔ افتخار عارف نے لکھنؤ کی فضاؤں میں ماضی اور اپنے دور کی شاعرانہ آوازوں کو سنا، دیکھا اور سمجھا۔ یہ آوازیں اُن کی ذات کا عنصر بن گئیں اور ایک تازہ اور توانا قوت کے درجے پر فائز ہوئیں۔ اپنی نوعمری میں افتخار عارف یہ نکتہ سیکھ گئے کہ:

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد

تو ان کی ذات کی توسیع ہوتی رہی ہے، ان کی آواز زندگی کے معمل میں نئے سانچوں میں ڈھلتی رہی، یہاں تک کہ ان کا لہجہ مخصوص شکل اختیار کر گیا۔ افتخار عارف کی طباعی، علم سے قوت حاصل کرتی رہی۔ الفاظ شناسی اور ترکیب تراشی کے مراحل ان پر آسان ہوتے گئے۔ افتخار کے شعورِ نغمہ کو بھی ان کے لہجے کی ترتیب و صورت گری میں بڑا دخل رہا ہے۔ ان کے ہاں روایتی روانی کی جگہ ایک ٹھہراؤ ہے اور ان کے اشعار پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ایک قدرتی چشمہ اظہار کے راستے کے پتھروں سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ افتخار عارف کی نحوی اور لسانی ترتیب و ترکیب بھی ایک جداگانہ ذائقہ رکھتی ہے اور ان کے لہجے کی منفرد خصوصیات کا منبع ہے۔ افتخار عارف کی منتخب بحروں میں ایک فن کارانہ ادھورا پن ہے۔ بات کہی بھی گئی اور کسی حد تک ناگفتہ بھی ہے۔ حضرت علیؑ کے الفاظ میں انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ زبان سے مراد الفاظ اور ان کے معانی ہیں۔

یہ ایک نام افتخار عارف کی تمام کاوشوں اور ان کی زندگی کی ہر جہت کو سمجھنے کے لیے ایک رمز ہے اور اس کی رمز کشائی ان کے کلام کی تفہیم کے لیے ضروری ہے۔ یہ نام، یہ اسم علیؑ ہے۔ یہ اسم، ایک حرفِ باریاب بھی ہے۔ یہ اسم اس شرر کا اشارہ ہے جو ہمارے رب نے

ہماری خاک میں رکھا ہے اور جو نانِ شعیر سے ادب اور زندگی دونوں کو آبرومند بناتا ہے۔

افتخار عارف کی شاعری کا بنیادی موضوع رزقِ جلیل ہے۔ یہی رزقِ جلیل قربتِ خسروانہ میں بھی ہمیں مرنے نہیں دیتا بلکہ حیاتِ ابدی کا سراغ دیتا ہے۔ یہی رزقِ جلیل اور نانِ جویں ہمیں اس مستقر تک پہنچاتی ہے جسے گھر کے علاوہ کسی دوسرے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ افتخار عارف کی شاعری کا موضوع رزقِ حلال اور وہ گوشۂ عافیت ہے جو مکان کو گھر بناتا ہے اور ان دونوں کا حصول ہمیشہ اُس منزل تک پہنچاتا ہے کہ موت ہمارے جسم کو چھوتی ہے مگر ہمارے وجود کے مرکز سے دور رہتی ہے۔

غزل کے رموز و علائم شاعری کو ''بیان'' بننے نہیں دیتے اور شعر اپنے مرتبۂ عالی سے نیچے نہیں اُترتا۔ افتخار عارف کی علامتوں میں ان کے موضوعات کو سمیٹنے کی قوت موجود ہے۔ علیؑ کی علامت کے مرکزیہ کے گرد اور کئی دائرے موجود ہیں۔ حسینؑ، کربلا، فرات، صبر، استقامت۔ کربلا ایک گزرا ہوا واقعہ نہیں بلکہ زندگی کا ایک مرحلۂ مستقل ہے۔ کربلا اس قطرۂ خون کا نام ہے جو ہمیں مقتل تک لے جاتا ہے اور بار ہا۔ سید سلیمان ندوی یاد آ گئے:

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

غزل گو شاعر کا کمال اور فن یہی ہے کہ وہ اپنے بنیادی خیالات اور فکر کو جذبہ بنا دیتا ہے۔ جذبے کا یہی رنگ و آہنگ شعر کو فلسفے سے الگ اور ممتاز کرتا ہے کہ مجرد خیالات انسانی زندگی کی ہمہ گیری، گرمی اور گیرائی سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ اسی ہمہ گیری نے افتخار عارف کے اس شعر کو ضرب المثل کے درجے پر فائز کر دیا ہے:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس کو گھر کر دے

کسی معاشرے کے عام عقائد اور تصورات کو شعر کے وسیلے سے ضرب المثل بنا دینا ایک آسان بات ہے۔ ذوق نے اسی بات کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا مگر افتخار عارف نے اپنے فکر کو یہ عمومیت عطا کر کے سخن وری کا حق ادا کیا ہے۔

افتخار عارف نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے اندازِ زیست کو اپنی غزل میں انسانی صورتِ حال بنادیا ہے۔ ہم نے ادیبوں اور مشائخ کے اجتماعات میں بیشتر ہاتھوں کو کاسۂ طلب میں بدلتے دیکھا ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو کہاں کی غیرت اور کہاں کی عزتِ نفس:

ابھی اٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دستِ کرم
کہ سارا شہر لیے کاسۂ طلب نکلا!

اور انھی مناظرِ امروز میں کربلا کا استعارہ صداقتِ امروز بن کر ابھرتا ہے:

صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

ان چند اشارات میں غزل کے آئینے میں افتخار عارف کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کاش حالات اور صحت اس کی اجازت دے کہ یہ اشارے غزل کی علامتوں کی حد سے بڑھ کر تنقید کی وضاحت بن سکیں۔

کوئی جنوں کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے
بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے

ہوا بھی ہو گئی میثاقِ تیرگی میں فریق
کوئی چراغ نہ اب رہگزر میں رکھا جائے

اُسی کو بات نہ پہنچے جسے پہنچنی ہو
یہ التزام بھی عرضِ ہنر میں رکھا جائے

نہ جانے کون سے ترکش کے تیر کب چل جائیں
نشانِ مہر کمانِ سپہر میں رکھا جائے

وفا گمان ہی ٹھہری تو کیا ضرور کہ اَب
لحاظِ ہم سفری بھی سفر میں رکھا جائے

ہر اک سے پوچھتے پھرتے ہیں تیرے خانہ بدوش
عذابِ دربدری کس کے گھر میں رکھا جائے

ہمیں بھی عافیتِ جاں کا ہے خیال بہت
ہمیں بھی حلقۂ نا معتبر میں رکھا جائے
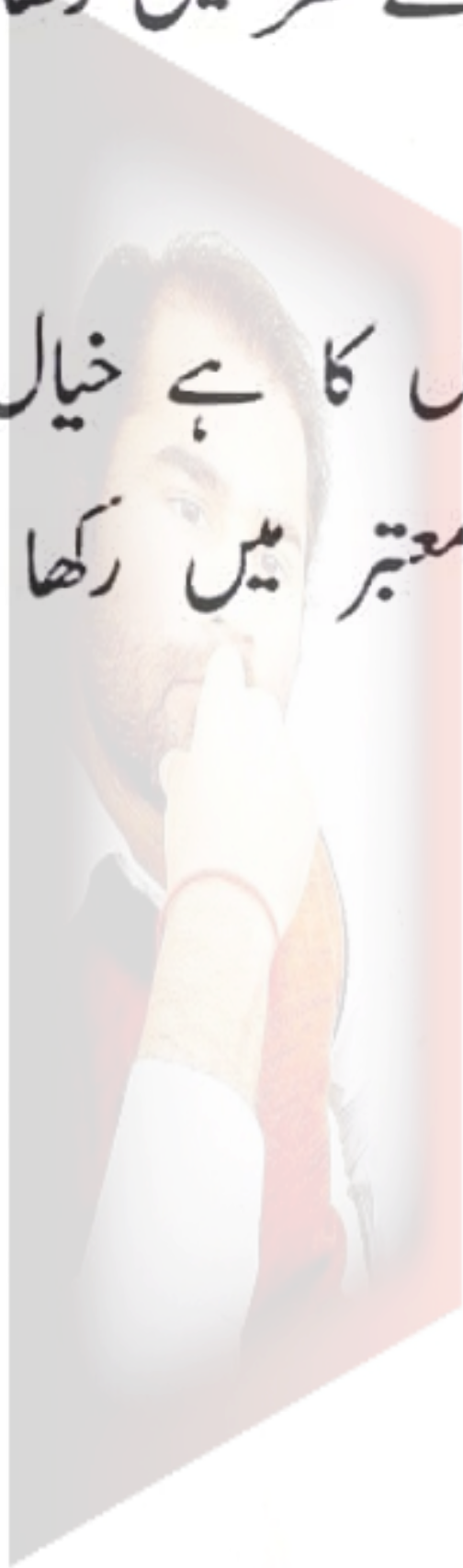
ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے
کاروبارِ جنوں عام تو ہے مگر اِک ذرا مختلف ہے

آج کی رات ننھی سی لَو بھی اگر بچ رہے تو غنیمت
اے چراغِ سرِ کوچۂ باد! اب کے ہوا مختلف ہے

اب کے بالکل نئے رنگ سے لکھ رہے ہیں سخن ور قصیدے
حرف تو سب کے سب ہیں رجز کے مگر مدّعا مختلف ہے

اب کے مَیں نے کتابِ مساوات ایک اک ورق پڑھ کے دیکھی
متن میں جانے کیا کچھ لکھا ہے مگر حاشیہ مختلف ہے

خیمۂ عافیت کے طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقتِ شہر
جاننا چاہتی ہے کہ منزل سے کیوں راستہ مختلف ہے

سب کے سب اپنے کاندھوں سے غیروں کا سر جوڑنے میں لگے ہیں
ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں کا خدا مختلف ہے

شیشہ کاروں کے زعمِ ہنر آشنائی کا انجام معلوم
اب انھیں کون سمجھائے پتھر سے کیوں آئنہ مختلف ہے
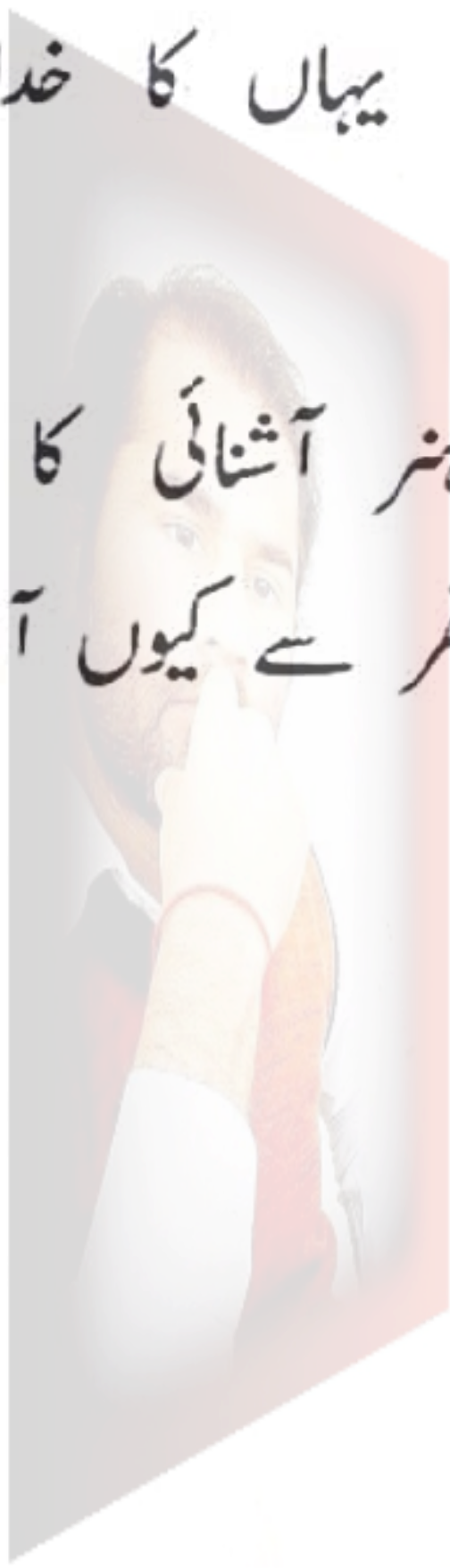
وہی پیاس ہے، وہی دشت ہے، وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

صبح سویرے رَن پڑنا ہے اور گھمسان کا رَن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک اُمید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے

دریا پر قبضہ تھا جس کا اس کی پیاس عذاب
جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے

کاسۂ شام میں سورج کا سر اور آوازِ اذان
اور آوازِ اذاں کہتی ہے فرض نبھانا ہے

سب کہتے ہیں اور کوئی دن یہ ہنگامۂ دہر
دِل کہتا ہے ایک مسافر اور بھی آنا ہے

ایک جزیرہ اس کے آگے پیچھے سات سمندر
سات سمندر پار سنا ہے ایک خزانہ ہے
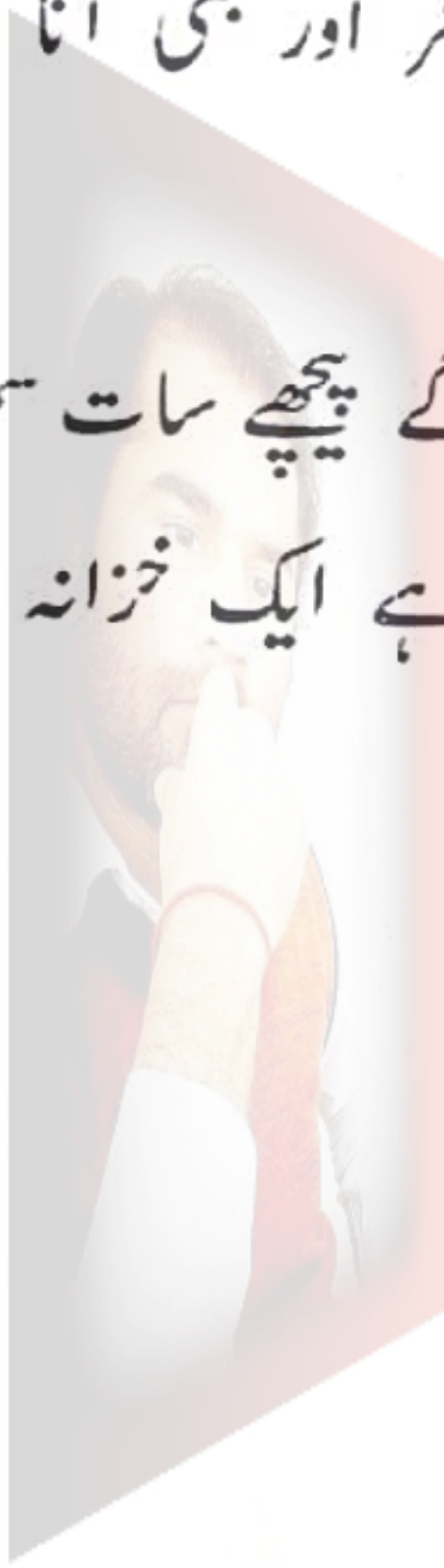
حریمِ لفظ میں کس درجہ بے ادب نکلا
جسے نجیب سمجھتے تھے کم نسب نکلا

سیاہِ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگارِ شب نکلا

ہماری گرمیِ گفتار بھی رہی بے سود
کسی کی چپ کا بھی مطلب عجب عجب نکلا

بہم ہوئے بھی مگر دِل کی وحشتیں نہ گئیں
وصال میں بھی دِلوں کا غبار کب نکلا

ابھی اُٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دستِ کرم
کہ سارا شہر لیے کاسۂ طلب نکلا

کہاں کے نام و نسب علم کیا فضیلت کیا
جہانِ رزق میں توقیرِ اہلِ حاجت کیا

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا

دمشقِ مصلحت و کوفۂ نفاق کے بیچ
فغانِ قافلۂ بے نوا کی قیمت کیا

مآلِ عزتِ ساداتِ عشق دیکھ کے ہم
بدل گئے تو بدلنے پہ اتنی حیرت کیا

فروغِ صنعتِ قد آوری کا موسم ہے
سبک ہوئے پہ بھی نکلا ہے قد و قامت کیا

اب بھی توہینِ اطاعت نہیں ہوگی ہم سے
دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے

روز اِک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے

دل کے معبود جبینوں کے خداؤں سے الگ
ایسے عالم میں عبادت نہیں ہوگی ہم سے

اُجرتِ عشق وفا ہے تو ہم ایسے مزدور
کچھ بھی کرلیں گے یہ محنت نہیں ہوگی ہم سے

ہر نئی نسل کو اِک تازہ مدینے کی تلاش
صاحبو! اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے

سخن آرائی کی صورت تو نکل سکتی ہے
پر یہ چکّی کی مشقت نہیں ہوگی ہم سے

حامی بھی نہ تھے منکرِ غالب بھی نہیں تھے
ہم اہلِ تذبذب کسی جانب بھی نہیں تھے

اس بار بھی دُنیا نے ہدف ہم کو بنایا
اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے

بیچ آئے سرِ قریۂ زر جوہرِ پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اُتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

لَو دیتی ہوئی رات سخن کرتا ہوا دن
سب اُس کے لیے جس سے مخاطب بھی نہیں تھے

مرے خدا مجھے اِتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس کو گھر کر دے

یہ روشنی کے تعاقب میں بھاگتا ہوا دِن
جو تھک گیا ہے تو اب اُس کو مختصر کر دے

میں زندگی کی دُعا مانگنے لگا ہوں بہت
جو ہو سکے تو دُعاؤں کو بے اثر کر دے

ستارۂ سحری ڈوبنے کو آیا ہے
ذرا کوئی مرے سورج کو باخبر کر دے

قبیلہ وار کمانیں کڑکنے والی ہیں
مرے لہو کی گواہی مجھے نڈر کر دے

میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا
اُجاڑ دے مری مٹی کو در بدر کر دے

مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے
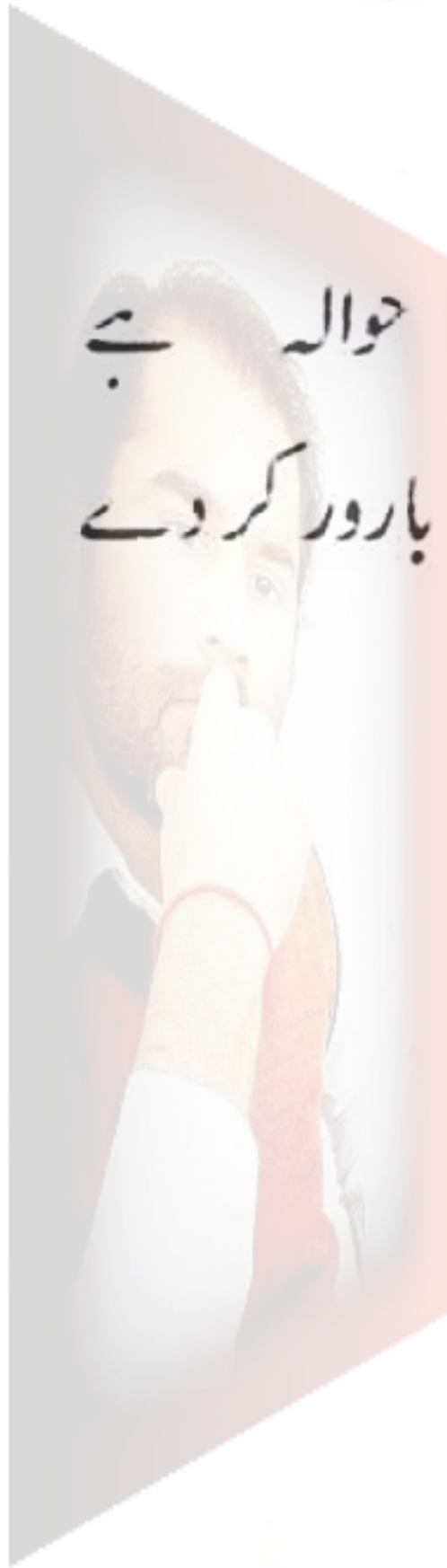
حبسِ شب ہو تو اُجالے بھی ترے شہر سے آئیں
خواب دیکھوں تو حوالے بھی ترے شہر سے آئیں

تیرے ہی شہر میں سر تن سے جدا ہو جائے
خوں بہا مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں

بات تو جب ہے کہ اے گریہ کُنِ حرمتِ حرف
مدحِ قاتل میں مقالے بھی ترے شہر سے آئیں

محضرِ جاں طلبی پر بھی ترے نام کی مہر
جان سے جاؤں تو نالے بھی ترے شہر سے آئیں

وقت اگر بیعتِ ہر سنگ پہ اصرار کرے
آئنہ مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوکِ سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

پتھر پر سر رکھ کر سونے والے دیکھے
ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

قاتل جس کی زد سے خود محفوظ رہ سکے
ایسا کوئی خنجر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

اپنے ہی خیموں پر جو شب خون نہ مارے
ایسا کوئی لشکر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

شاخِ بریدہ کھلی فضا سے پوچھ رہی ہے
کوئی شکستہ پر نہیں دیکھا بہت دِنوں سے

زنداں اہلِ جنوں کو شاید راس آ گیا
دیواروں میں در نہیں دیکھا بہت دنوں سے

خاک اُڑانے والے لوگوں کی بستی میں!
کوئی صورت گر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

سچے سائیں ہمارے حضرت مہر علی شاہؒ
بابا! ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

بستی بھی سمندر بھی بیاباں بھی مرا ہے
آنکھیں بھی مری خوابِ پریشاں بھی مرا ہے

جو ڈوبتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری
جو ٹوٹتا جاتا ہے وہ پیماں بھی مرا ہے

جو ہاتھ اُٹھے تھے، وہ سبھی ہاتھ تھے میرے
جو چاک ہوا ہے وہ گریباں بھی مرا ہے

جس کی کوئی آواز نہ پہچان نہ منزل
وہ قافلۂ بے سروساماں بھی مرا ہے

ویرانۂ مقتل پہ حجاب آیا تو اس بار
خود چیخ پڑا میں کہ یہ عنواں بھی مرا ہے

وارفتگیِ صبحِ بشارت کو خبر کیا
اندیشۂ صد شامِ غریباں بھی مرا ہے

میں وارثِ گل ہوں کہ نہیں ہوں مگر اے جان!
خمیازۂ توہینِ بہاراں بھی مرا ہے

مٹی کی گواہی سے بڑی دِل کی گواہی!
یوں ہو تو یہ زنجیر یہ زنداں بھی مرا ہے

جنوں کا رنگ بھی ہو شعلۂ نمو کا بھی ہو
سکوتِ شب میں اک انداز گفتگو کا بھی ہو

میں جس کو اپنی گواہی میں لے کے آیا ہوں
عجب نہیں کہ وہی آدمی عدو کا بھی ہو

وہ جس کے چاک گریباں پہ تہمتیں ہیں بہت
اسی کے ہاتھ میں شاید ہنر رفو کا بھی ہو

وہ جس کے ڈوبتے ہی ناؤ ڈگمگانے لگی
کسے خبر وہی تارہ ستارہ جُو کا بھی ہو

ثبوتِ محکمیِ جاں تھی جس کی بُرشِ ناز
اُسی کی تیغ سے رشتہ رگِ گلو کا بھی ہو

وفا کے باب میں کارِ سخن تمام ہوا
مری زمین پہ اک معرکہ لہو کا بھی ہو

سمندر اس قدر شوریدہ سر کیوں لگ رہا ہے
کنارے پر بھی ہم کو اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے

وہ جس کی جرأتِ پرواز کے چرچے بہت تھے
وہی طائر ہمیں بے بال و پر کیوں لگ رہا ہے

وہ جس کے نام سے روشن تھے مستقبل کے سب خواب
وہی چہرہ ہمیں نامعتبر کیوں لگ رہا ہے

بہاریں جس کی شاخوں سے گواہی مانگتی تھیں
وہی موسم ہمیں اب بے ثمر کیوں لگ رہا ہے

در و دیوار اتنے اجنبی کیوں لگ رہے ہیں
خود اپنے گھر میں آخر اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے

ہجر کی دھوپ میں چھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

رستہ دیکھنے والی آنکھوں کے اَن ہونے خواب
پیاس میں بھی دریاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں کچھ کر نہیں پاتے
پھر بھی لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

ایک ذرا سی جوت کے بل پر اندھیاروں سے بیر
پاگل دیے ہواؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

رنگ سے خوشبوؤں کا ناتا ٹوٹتا جاتا ہے
پھول سے لوگ خزاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

ہم نے چپ رہنے کا عہد کیا ہے اور کم ظرف
ہم سے سخن آراؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

نئے سکندر ہیں اور ظلمات کا سفر بھی نیا نیا ہے
فریب کی منزلوں میں اندازِ حیلہ گر بھی نیا نیا ہے

کڑی کمانوں کے تیر بے اعتبار ہاتھوں میں آ گئے ہیں
دُعا نئی تھی سو اب یہ خمیازۂ اثر بھی نیا نیا ہے

ابھی تو ہم طائرانِ کم حوصلہ نہ پرواز کر سکیں گے
ابھی شکستہ پروں میں اندوہِ بال و پر بھی نیا نیا ہے

یقیں پہ شب خون پڑ چکے پھر بھی لوگ نا مطمئن نہیں ہیں
نہالِ اندیشہ و گماں! تیرا یہ ثمر بھی نیا نیا ہے

نفاق و نفرت کی آندھیاں پھر اُجاڑ دیں گی تو کیا کریں گے
نئی زمینوں پہ بسنے والوں میں اِک یہ ڈر بھی نیا نیا ہے

فروغِ خورشید کی بشارت پہ ظلمتیں رقص کر رہی ہیں
سوادِ شب میں طلسمِ آوازۂ سحر بھی نیا نیا ہے

بصیر ذہنوں کو برسرِ عام آگہی کی سزا ملے گی
دیارِ درویش میں یہ فرمانِ آب زر بھی نیا نیا ہے
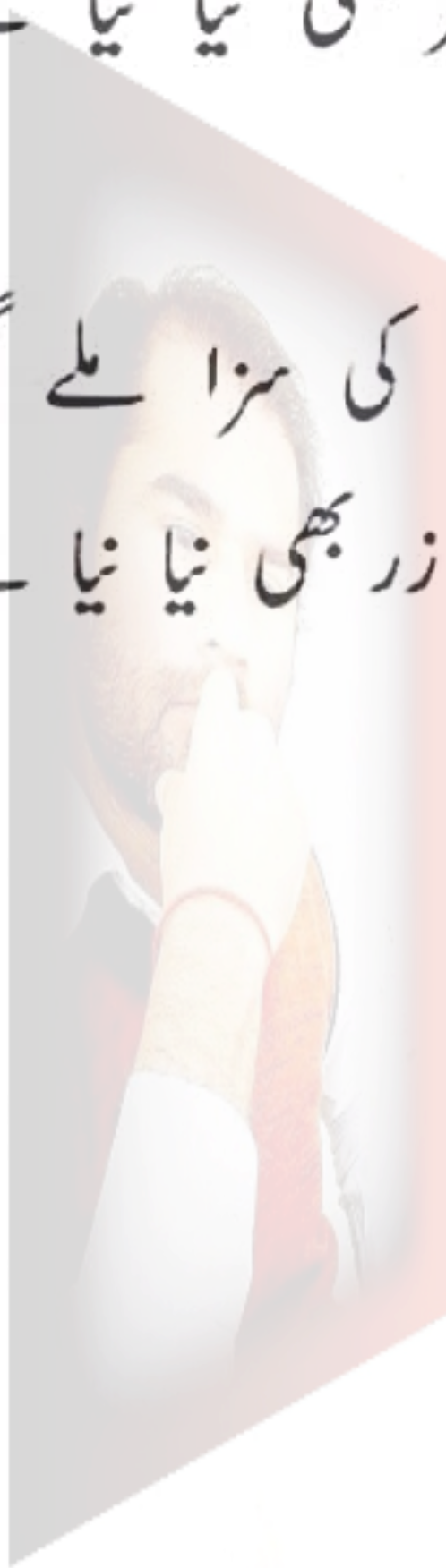
عذابِ وحشتِ جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی
نئے سفر کے لیے راستہ نہ مانگے کوئی

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دُعا نہ مانگے کوئی

تمام شہر مکرم بس ایک مجرم میں
سو میرے بعد مرا خوں بہا نہ مانگے کوئی

کوئی تو شہرِ تذبذب کے ساکنوں سے کہے
نہ ہو یقین تو پھر معجزہ نہ مانگے کوئی

عذابِ گردِ خزاں بھی نہ ہو بہار بھی آئے
اس احتیاط سے اجرِ وفا نہ مانگے کوئی

وہی خوف جس سے لرز رہا ہے ترا وجود
اُسی خوف کو ہدفِ دعائے شبانہ کر

ترا رزق ہی سببِ مرض ہے تو اب کی بار
ذرا جم کے ردِّ وبالِ درہم و دانہ کر

دن گزرا آشفتہ سر خاموش ہوئے
شام ہوئی اور بام و در خاموش ہوئے

شام ہوئی اور سورج رستہ بھول گیا
کیسے ہنستے بستے گھر خاموش ہوئے

بولتی آنکھیں چپ دریا میں ڈوب گئیں
شہر کے سارے تہمت گر خاموش ہوئے

کیسی کیسی تصویروں کے رنگ اُڑے
کیسے کیسے صورت گر خاموش ہوئے

کھیل تماشا بربادی پر ختم ہوا
ہنسی اُڑا کر بازی گر خاموش ہوئے

کچی دیواریں بارش میں بیٹھ گئیں
بیتی رُت کے سب منظر خاموش ہوئے

ابھی گیا ہے کوئی مگر یوں لگتا ہے
جیسے صدیاں بیتیں گھر خاموش ہوئے
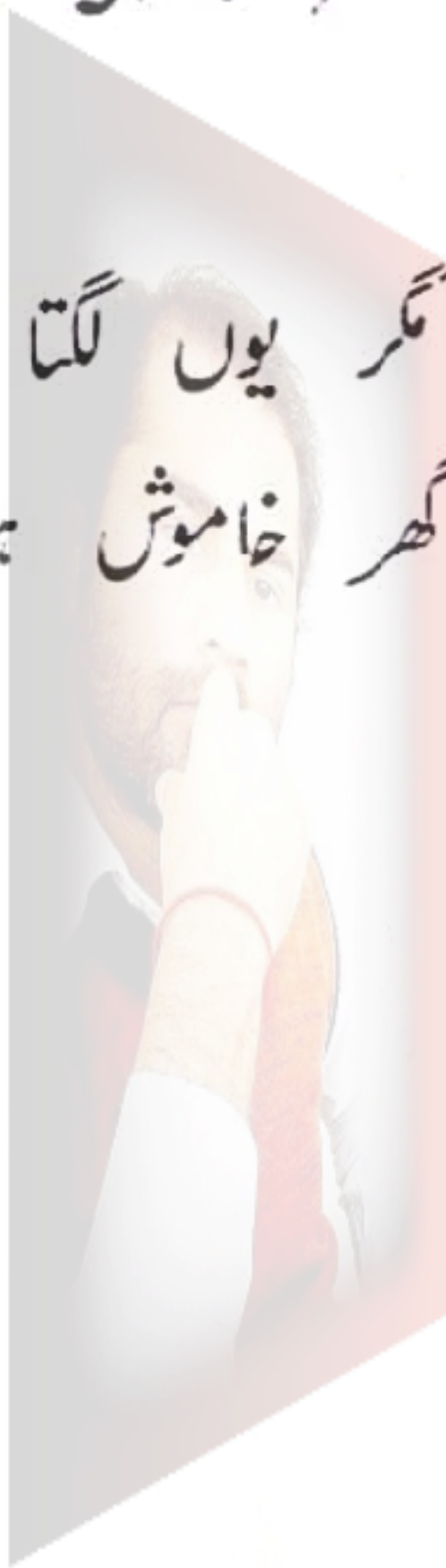
دیارِ نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کا ساتھی ہو

میں اُس سے جھوٹ بھی بولوں تو مجھ سے سچ بولے
مرے مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو

میں اس کے ہاتھ نہ آؤں وہ میرا ہو کے رہے
میں گر پڑوں تو مری پستیوں کا ساتھی ہو

وہ میرے نام کی نسبت سے معتبر ٹھہرے
گلی گلی مری رسوائیوں کا ساتھی ہو

کرے کلام جو مجھ سے تو میرے لہجے میں
میں چپ رہوں تو مرے تیوروں کا ساتھی ہو

میں اپنے آپ کو دیکھوں وہ مجھ کو دیکھے جائے
وہ میرے نفس کی گمراہیوں کا ساتھی ہو

وہ خواب دیکھے تو دیکھے مرے حوالے سے
مرے خیال کے سب منظروں کا ساتھی ہو
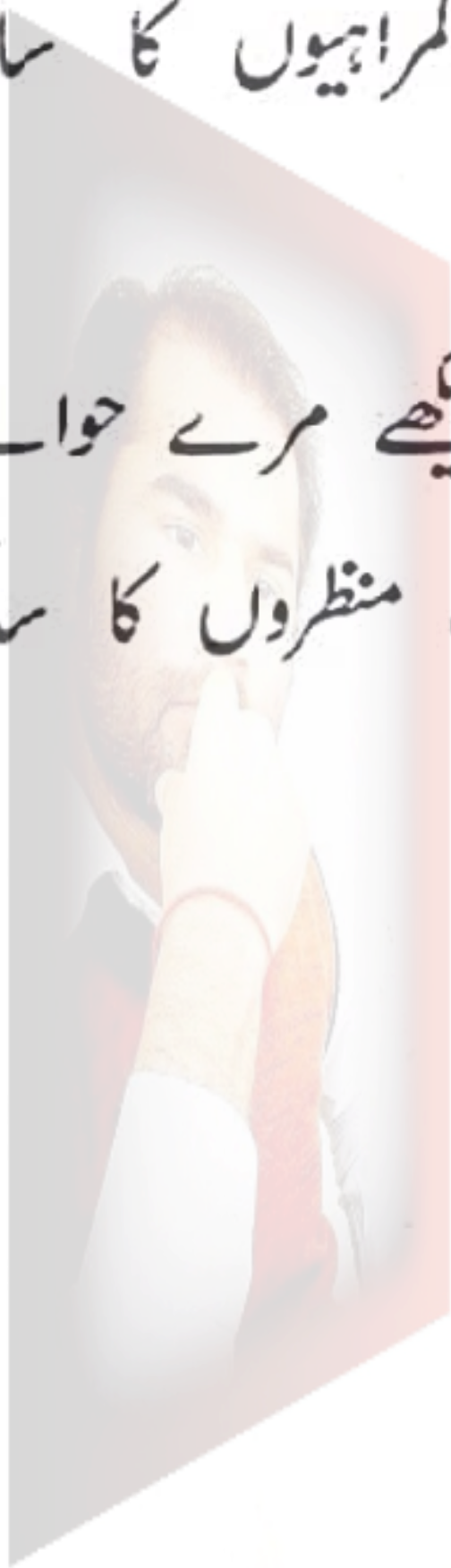
عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

اُس ایک خواب کی حسرت میں جل بجھیں آنکھیں
وہ ایک خواب کہ اب تک نظر نہیں آیا

کریں تو کس سے کریں نارسائیوں کا گلہ
سفر تمام ہوا ہم سفر نہیں آیا

دلوں کی بات بدن کی زباں سے کہہ دیتے
یہ چاہتے تھے مگر دِل اِدھر نہیں آیا

عجیب ہی تھا مرے دورِ گمرہی کا رفیق
بچھڑ گیا تو کبھی لوٹ کر نہیں آیا

حریمِ لفظ و معانی سے نسبتیں بھی رہیں
مگر سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں آیا

ایک اور تازیانہ منظر لگا ہمیں
آ اے ہوائے تازہ! نئے پر اگا ہمیں

ندی چڑھی ہوئی تھی تو ہم بھی تھے موج میں
پانی اُتر گیا تو بہت ڈر لگا ہمیں

دل پر یقیں نہیں تھا سو اب کے محاذ پر
دُشمن کا اک سوار بھی لشکر لگا ہمیں

گڑیوں سے کھیلتی ہوئی بچی کی آنکھ میں
آنسو بھی آ گیا تو سمندر لگا ہمیں

بیٹا گرا جو چھت سے پتنگوں کے پھیر میں
کل آسماں پتنگ برابر لگا ہمیں

دادِ متاعِ عجز کہ تقدیر میں نہ تھی
الزامِ خود سری تھا کہ اُڑ کر لگا ہمیں

سمجھ رہے ہیں مگر بولنے کا یارا نہیں
جو ہم سے مل کے بچھڑ جائے وہ ہمارا نہیں

ابھی سے برف اُلجھنے لگی ہے بالوں سے
ابھی تو قرضِ مہ و سال بھی اُتارا نہیں

بس ایک شام اُسے آواز دی تھی ہجر کی شام
پھر اس کے بعد اُسے عمر بھر پکارا نہیں

ہوا کچھ ایسی چلی ہے کہ تیرے وحشی کو
مزاج پُرسیِ بادِ صبا گوارا نہیں

سمندروں کو بھی حیرت ہوئی کہ ڈوبتے وقت
کسی کو ہم نے مدد کے لیے پکارا نہیں

وہ ہم نہیں تھے تو پھر کون تھا سرِ بازار
جو کہہ رہا تھا کہ بکنا ہمیں گوارا نہیں

ہم اہلِ دل ہیں محبت کی نسبتوں کے امین
ہمارے پاس زمینوں کا گوشوارا نہیں
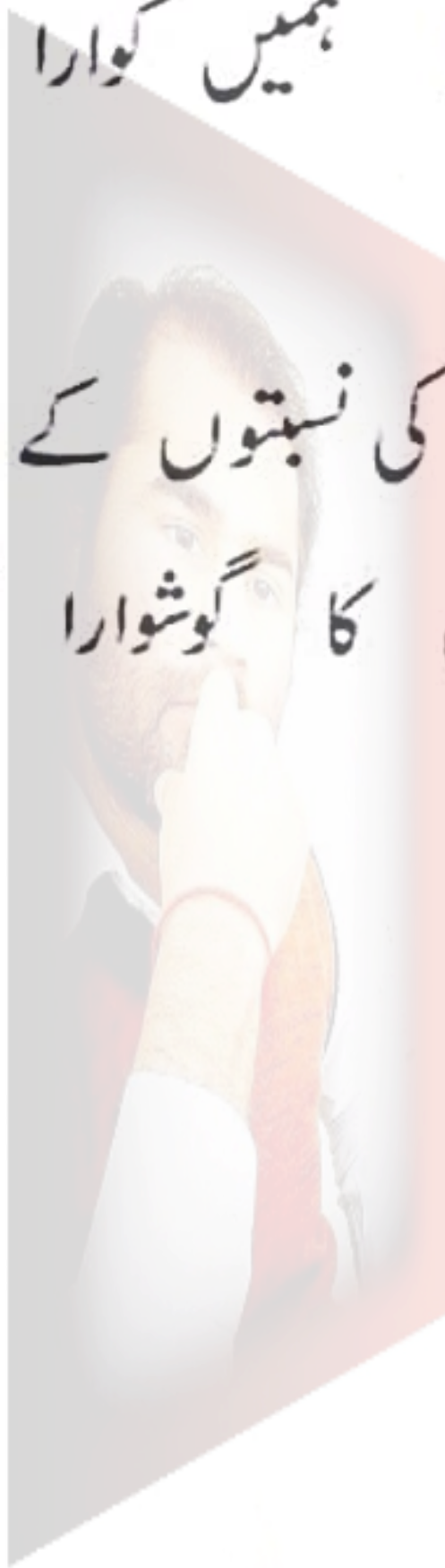
یہ بستی جانی پہچانی بہت ہے
یہاں وعدوں کی ارزانی بہت ہے

شگفتہ لفظ لکھے جا رہے ہیں
مگر لہجوں میں ویرانی بہت ہے

سبک ظرفوں کے قابو میں نہیں لفظ
مگر شوقِ گل افشانی بہت ہے

ہے بازاروں میں پانی سر سے اونچا
مرے گھر میں بھی طغیانی بہت ہے

نہ جانے کب مرے صحرا میں آئے
وہ اک دریا کہ طوفانی بہت ہے

نہ جانے کب مرے آنگن میں برسے
وہ اک بادل کہ نقصانی بہت ہے

تھکن تو اگلے سفر کے لیے بہانہ تھا
اُسے تو یوں بھی کسی اور سمت جانا تھا

وہی چراغ بجھا جس کی لَو قیامت تھی
اُسی پہ ضرب پڑی جو شجر پرانا تھا

متاعِ جاں کا بدل ایک پل کی سرشاری
سلوک خواب کا آنکھوں سے تاجرانہ تھا

ہوا کی کاٹ شگوفوں نے جذب کر لی تھی
تبھی تو لہجۂ خوشبو بھی جارحانہ تھا

وہی فراق کی باتیں وہی حکایتِ وصل
نئی کتاب کا ایک اِک ورق پرانا تھا

قبائے زرد نگارِ خزاں پہ سجتی تھی
تبھی تو چال کا انداز خسروانہ تھا
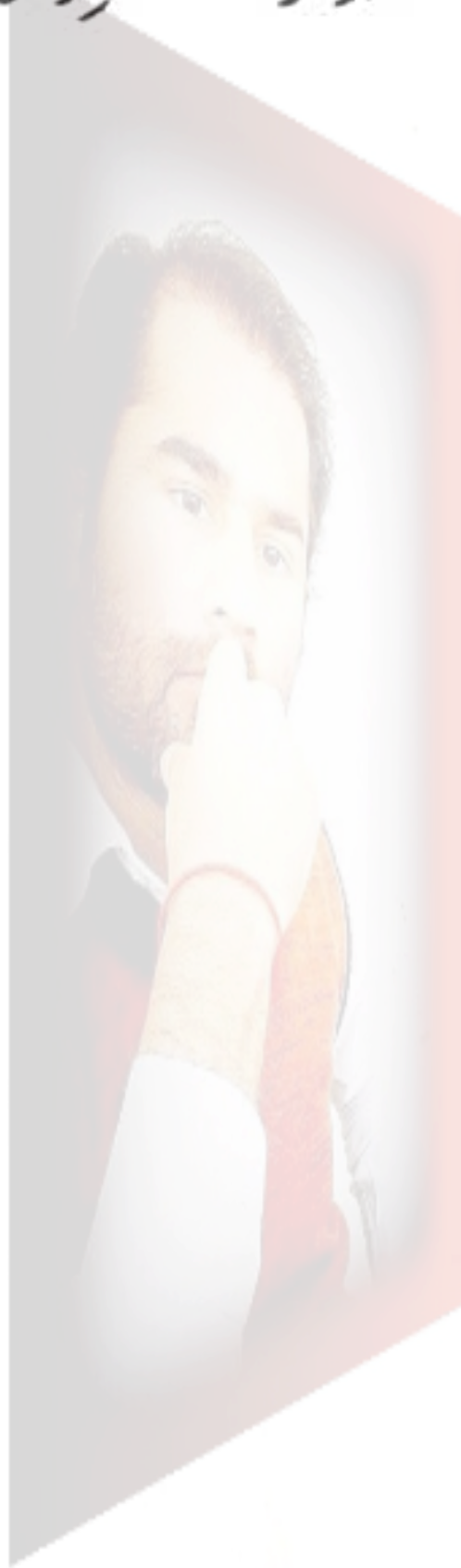
رنگ تھا روشنی تھا قامت تھا
جس پہ ہم مر مٹے قیامت تھا

خوش جمالوں میں دُھوم تھی اپنی
نام اس کا بھی وجہِ شہرت تھا

پاسِ آوارگی ہمیں بھی بہت!
اس کو بھی اعترافِ وحشت تھا

ہم بھی تکرار کے نہ تھے خوگر
وہ بھی ناآشنائے حُجت تھا

خواب تعبیر بن کے آتے تھے
کیا عجب موسمِ رفاقت تھا

اپنے لہجے کا بانکپن سارا
اس کے پندار کی امانت تھا

اس کے کندن بدن کا رُوپ سروپ
حسنِ احساس کی بدولت تھا

ایک اک سانس قربتوں کا گواہ
ہر نفس لمحۂ غنیمت تھا

اور پھر یوں ہوا کہ ٹوٹ گیا
وہ جو اک رشتۂ محبت تھا

مثلِ موجِ رواں گزر گئی شب
مہرباں مہرباں گزر گئی شب

دھوپ آنکھوں میں چبھ رہی ہے جان!
مان بھی لو کہ ہاں گزر گئی شب

جان! بے فیض دِن طلوع ہوا
جانِ جاناں جاں گزر گئی شب

کس قدر پیچ لے کے آئی تھی
اور کیسی رواں گزر گئی شب

ستم روزگار شاد آباد!
کرمِ آسماں گزر گئی شب

وحشت انگیزیِ نشاط کی خیر
خوش گماں خوش گماں گزر گئی شب

لے کے دامن میں شب چراغ اپنے
کیسی دامن کشاں گزر گئی شب

سرپھری بارشوں میں آئی تھی
کیسی آتش بجاں گزر گئی شب

دھیرے دھیرے لہو میں پھیل گئی
اور پھر ناگہاں گزر گئی شب

رخصت اے ساحلِ صدف امکان
کھل گئے بادباں گزر گئی شب

کیسے کیسے خواب سجے ہیں دیکھو تو
آنکھوں میں کچھ رنگ نئے ہیں دیکھو تو

دھنک کنج سے آنے والے رنگ سفیر
ڈالی ڈالی جھول رہے ہیں دیکھو تو

پونم رات، اُونچی پہاڑیاں اور چکور
کس کا رستہ دیکھ رہے ہیں دیکھو تو

دُھول نہائے تھکن سمیٹے گل سپنے
سورج بن کر جاگ پڑے ہیں دیکھو تو

نرم نرم شاخوں پر ننھے ننھے پھول
کیسے تم کو دیکھ رہے ہیں دیکھو تو

گئی رُتوں کی بارش میں بھیگے پنچھی
اُڑنے کو پر تول رہے ہیں دیکھو تو

اس باری تو چاند کے اُجلے ماتھے پر
ہم دونوں کے نام لکھے ہیں دیکھو تو

میں نے تمھاری قربت کی سرشاری میں
کیسے اچھے شعر لکھے ہیں دیکھو تو

گلی کوچوں میں تشہیرِ وفا اچھی لگی ہم کو
سخن ارزانیِ خلقِ خدا اچھی لگی ہم کو

یہاں کے لوگ اپنے خواب اپنے دل میں رکھتے ہیں
تمھارے شہر کی یہ اِک ادا اچھی لگی ہم کو

یہ عالم ہے کہ اَب کوئی بدن باسی نہیں لگتا
نیا موسم نئی آب و ہوا اچھی لگی ہم کو

زمانہ کیسی کیسی زندہ آوازوں سے روشن ہے
مگر ہم ہیں کہ بس اپنی صدا اچھی لگی ہم کو

دلوں میں جو بھی تھا جیسا بھی تھا دیوار پر آیا
فغانِ خلقتِ بے دست و پا اچھی لگی ہم کو

ہم تو دیوانے ہیں رمزیں نہ کنایہ جانیں
جُز غمِ عشق ہر اک زخم کو مایا جانیں

کج کلاہی پہ نہ جائیں کہ یہ سب آپ کی نذر
شہِ خوباں ہمیں بس اپنی رعایا جانیں

آج کے بعد تو ہم پر بھی یہ لازم ہے کہ ہم
اپنی بوئی ہوئی فصلوں کو پرایا جانیں

ہم سے کیا کون سا سورج ہے سرِ بام بلند
ہم تو وہ لوگ ہیں ہر دھوپ کو سایہ جانیں

خیمۂ صبر سے ٹکرا کے پلٹنے لگے تیر
اب انھیں سینۂ قاتل میں در آیا جانیں

سرِ شاخِ صُبح کھلا گلاب یقین کا
یہ مرا یقین کرم ہے ایک امین کا

یہ نمود و نام مرے وُجود کی بازگشت
یہ مرا وجود غبار میری زمین کا

مری ٹوٹ پھوٹ مری نظر کی شکست وریخت
یہ شکست و ریخت حجاب فتحِ مبین کا

میں وہ ہوں کہ میرے چہار سمت غنیم اور
مجھے اِعتبار یسار کا نہ یمین کا

کبھی میرے نام سے بھی کوئی سندِ وفا
کبھی میرے حق میں بھی فیصلہ ہو زمین کا

کبھی اعتبار کبھی فرار کبھی پناہ
کوئی رابطہ تو رہے مکان و مکین کا

چلو آؤ شہرِ گماں میں چل کے صدا لگائیں
کہ وہیں کہیں سے ملے گا اجر یقین کا

کبھی کُھل کے لکھ جو گزر رہا ہے زمین پر
کبھی قرض بھی تو اُتار اپنی زمین کا

کہیں سے کوئی حرفِ مُعتبر شاید نہ آئے
مسافر لوٹ کر اب اپنے گھر شاید نہ آئے

قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو خیالِ بال و پر شاید نہ آئے

کسے معلوم اہلِ ہجر پر ایسے بھی دِن آئیں
قیامت سر سے گزرے اور خبر شاید نہ آئے

جہاں راتوں کو پڑ رہتے ہوں آنکھیں موند کر لوگ
وہاں مہتاب میں چہرہ نظر شاید نہ آئے

کبھی ایسا بھی دن نکلے کہ جب سورج کے ہمراہ
کوئی صاحب نظر آئے مگر شاید نہ آئے

سبھی کو سہل انگاری ہنر لگنے لگی ہے
سروں پر اب غبارِ رہگزر شاید نہ آئے

پھول مہکیں مرے آنگن میں صبا بھی آئے
تو جو آئے تو مرے گھر میں خدا بھی آئے

اس قدر زخم لگائے ہیں زمانے نے کہ بس
اب کے شاید ترے کوچے کی ہوا بھی آئے

یہ بھی ہے کوچۂ جاناں کی روایت کہ یہاں
لب پہ شکوہ اگر آئے تو دُعا بھی آئے

میں نے سو طرح جسے دل میں چھپائے رکھا
لوگ وہ زخم زمانے کو دِکھا بھی آئے

کیا قیامت ہے جو سورج اُتر آیا سر پر
میری آنکھوں میں در آئے تو مزا بھی آئے

پچھلے موسم تو بڑا قحط رہا خوابوں کا
اب کے شاید کوئی احساس نیا بھی آئے

کوئی تو پھول کھلائے دُعا کے لہجے میں
عجب طرح کی گھٹن ہے ہوا کے لہجے میں

یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں

نہ جانے خلقِ خدا کون سے عذاب میں ہے
ہوائیں چیخ پڑیں التجا کے لہجے میں

کُھلا فریبِ محبت دکھائی دیتا ہے
عجب کمال ہے اُس بے وفا کے لہجے میں

یہی ہے مصلحتِ جبرِ احتیاط تو پھر
ہم اپنا حال کہیں گے چھپا کے لہجے میں

عشق کیسا کہ بھروسا بھی نہیں تھا شاید
اس سے میرا کوئی رشتہ بھی نہیں تھا شاید

خلقتِ شہر میں جس ہار کے چرچے ہیں بہت
میں وہ بازی کبھی کھیلا بھی نہیں تھا شاید

زیست کرنے کے سب آداب اُسے ازبر تھے
مجھ کو مرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا شاید

خاک اُڑاتے ہوئے بازاروں میں دیکھا سب نے
میں کبھی گھر سے نکلتا بھی نہیں تھا شاید

اُس کی آنکھوں میں بشارت تھی نئے خوابوں کی
میں اُسے دیکھ کے چونکا بھی نہیں تھا شاید

ایک بادل کہ مرے نام سے منسوب ہوا
مرے صحرا میں تو برسا بھی نہیں تھا شاید
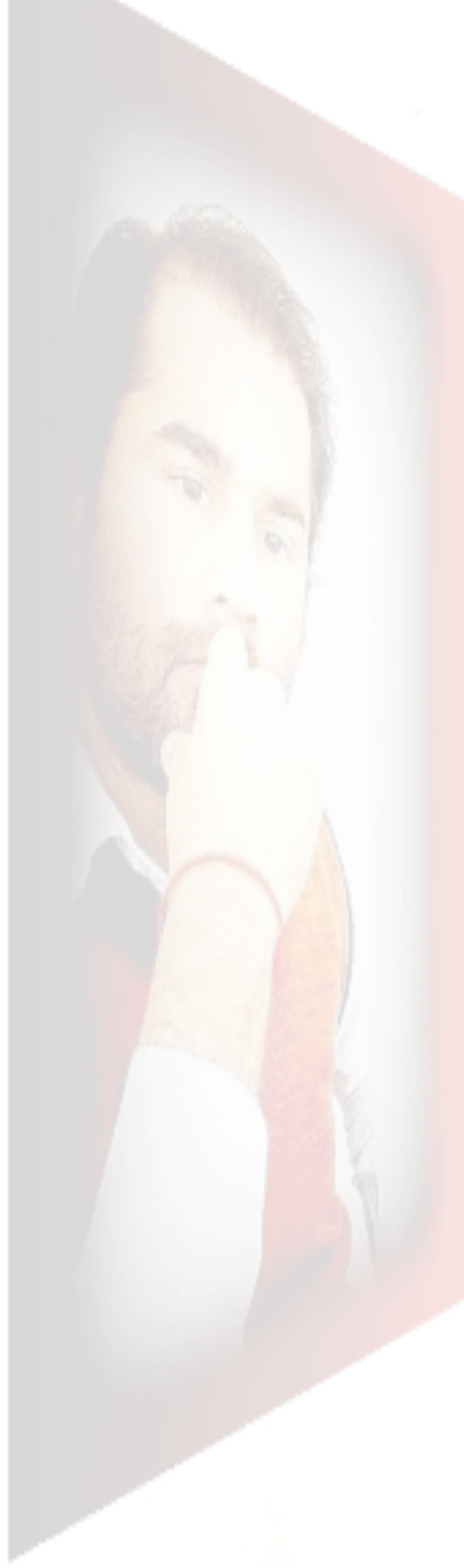
ذرا سی دیر کو آئے تھے خواب آنکھوں میں
پھر اس کے بعد مسلسل عذاب آنکھوں میں

وہ جس کے نام کی نسبت سے روشنی تھا وجود
کھٹک رہا ہے وہی آفتاب آنکھوں میں

جنھیں متاعِ دل و جاں سمجھ رہے تھے ہم
وہ آئنے بھی ہوئے بے حجاب آنکھوں میں

عجب طرح کا ہے موسم کہ خاک اُڑتی ہے
وہ دن بھی تھے کہ کِھلے تھے گلاب آنکھوں میں

مرے غزال تری وحشتوں کی خیر، کہ ہے
بہت دنوں سے بہت اضطراب آنکھوں میں

نہ جانے کیسی قیامت کا پیش خیمہ ہے
یہ اُلجھنیں تری بے اِنتساب آنکھوں میں

جواز کیا ہے مرے کم سخن بتا تو سہی
بنامِ خوش نگہی ہر جواب آنکھوں میں

۞

شاخ بہ شاخ گھومیے اور گلاب دیکھیے
ایسا بھی کیا کہ عمر بھر ایک ہی خواب دیکھیے

ایسا بھی کیا کہ عمر بھر ایک سی تشنگی رہے
اور فریب کھائیے اور سراب دیکھیے

پیکرِ مہ وشاں بھی ہے ایک کھُلی ہوئی کتاب
حوصلے ساتھ دیں تو پھر نت نئے باب دیکھیے

ڈوب گئے جو ماہتاب اُن کو بھُلا بھی دیجیے
پھر نئے زخم کھائیے پھر نئے خواب دیکھیے

لوگ پہچان نہیں پائیں گے چہرا اپنا
اب نہ بدلے تو بدل جائے گا نقشہ اپنا

برق ایک ایک نشیمن کا پتا جانتی ہے
اب کے پھر ڈھونڈ نکالے گی ٹھکانا اپنا

طعنۂ دربدری دے مگر اتنا رہے دھیان
راستہ بھی تو بدل سکتے ہیں دریا اپنا

بول! اے بے سرو سامانیِ گلشن کچھ بول!
خلقتِ شہر طلب کرتی ہے حصّہ اپنا

یہ بھی کب تک کہ ہر آفت کا سبب ہے کوئی اور
منزلیں خود بھی تو گم کرتی ہیں رستہ اپنا

ہم کہاں اپنے سوا اور کو گردانتے ہیں
ہم نے لکھا بھی تو لکھیں گے قصیدہ اپنا

ہونے کو تو کیا ہوا نہیں ہے
ہم نے تو کبھی کہا نہیں ہے

سب اپنے جنوں کی وحشتیں ہیں
تجھ سے تو کوئی گلہ نہیں ہے

بکھروں تو کوئی سمیٹ لے گا
اس کا بھی تو آسرا نہیں ہے

کیا زیست کریں کہ اَب تو صاحب
مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے

ویرانۂ دشتِ جاں میں کوسوں
سائے کا کہیں پتا نہیں ہے

اُلجھا ہوں کچھ ایسے پیچ و خم میں
منزل تو ہے راستہ نہیں ہے

سرِ حجاب کھلا مجھ پر عریانی سے
کیسی پیاس بجھی ہے کیسے پانی سے

مات پہ مات دیے جاتی ہے ڈھلتی عمر
دِل ڈوبا جاتا ہے بدن ارزانی سے

میں نے کیسے جتن سے تختی لکھی تھی
وقت نے کیسا مٹا دیا آسانی سے

سجدۂ شکر کی ساعت جب بھی آتی ہے
کوئی اُلجھے لگتا ہے پیشانی سے

حرفِ صداقت کی تنہائی اپنی جگہ
خوف بہت آتا ہے سبک سامانی سے

جب تک اپنے آپ سے ملنا جلنا تھا
شعر بھی ہوتے رہتے تھے آسانی سے

یہ قرضِ کج کلہی کب تلک ادا ہو گا
تباہ ہو تو گئے ہیں اب اور کیا ہو گا

یہاں تک آئی ہے بچھڑے ہوئے لہو کی صدا
ہمارے شہر میں کیا کچھ نہیں ہوا ہو گا

غبارِ کوچۂ وعدہ بکھرتا جاتا ہے
اب آگے اپنے بکھرنے کا سلسلہ ہو گا

صدا لگائی تو پرسانِ حال کوئی نہ تھا
گمان تھا کہ ہر اک شخص ہم نوا ہو گا

کبھی کبھی تو وہ آنکھیں بھی سوچتی ہوں گی
بچھڑ کے رنگ سے خوابوں کا حال کیا ہوگا

ہوا ہے یوں بھی کہ اک عمر اپنے گھر نہ گئے
یہ جانتے تھے کوئی راہ دیکھتا ہوگا

ابھی تو دھند میں لپٹے ہوئے ہیں سب منظر
تم آؤ گے تو یہ موسم بدل چکا ہوگا
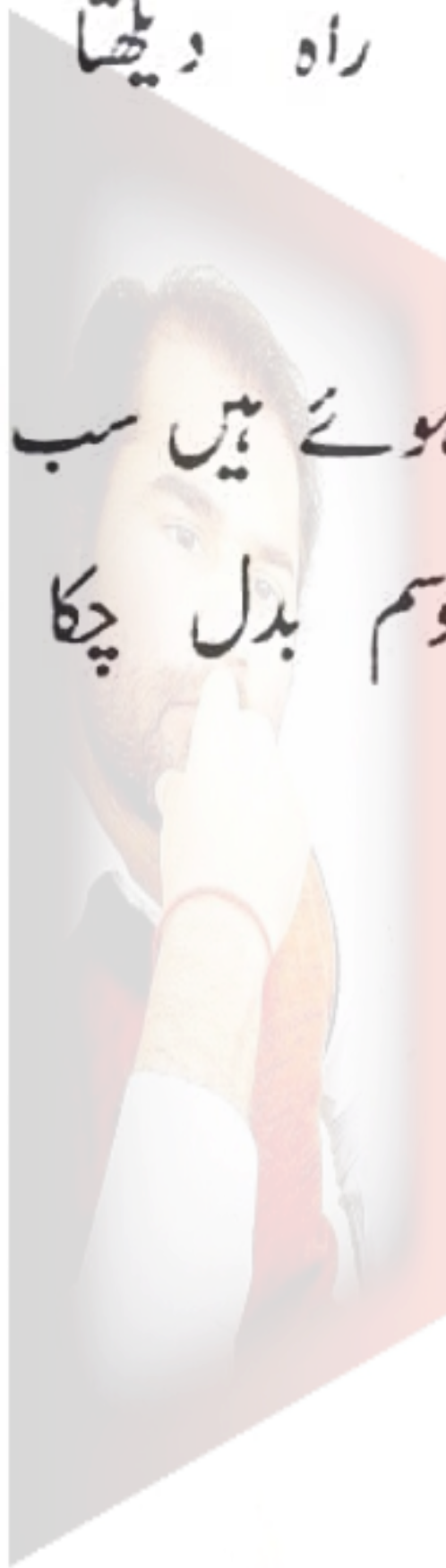
خواب کی طرح بکھر جانے کو جی چاہتا ہے
ایسی تنہائی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں مگر جانے کیوں
شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

ڈوب جاؤں تو کوئی موج نشاں تک نہ بتائے
ایسی ندی میں اُتر جانے کو جی چاہتا ہے

کبھی مل جائے تو رستے کی تھکن جاگ پڑے
ایسی منزل سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے

وہی پیماں جو کبھی جی کو خوش آیا تھا بہت
اُسی پیماں سے مکر جانے کو جی چاہتا ہے

اے مری زندگی کے خواب، شام بخیر شب بخیر
ڈوب چلا ہے آفتاب، شام بخیر شب بخیر

ایسا نہ ہو کہ دِن ڈھلے روح کا زخم کِھل اٹھے
کیسے کہوں مرے گلاب، شام بخیر شب بخیر

تیرہ شبی کی وحشتیں اَب کوئی دِن کی بات ہے
خلوتِ جاں کے ماہتاب، شام بخیر شب بخیر

میں بھی وفا سرشت ہوں پاسِ وفا تجھے بھی ہے
دونوں کُھلی ہوئی کتاب، شام بخیر شب بخیر

موسمِ اَبر و باد سے اب جو ڈریں تو کس لیے
کھل کے برس چکا سحاب، شام بخیر شب بخیر

میری نظر، مرا شعور، میری غزل، مرا جنوں
سب کا تجھی سے انتساب، شام بخیر شب بخیر
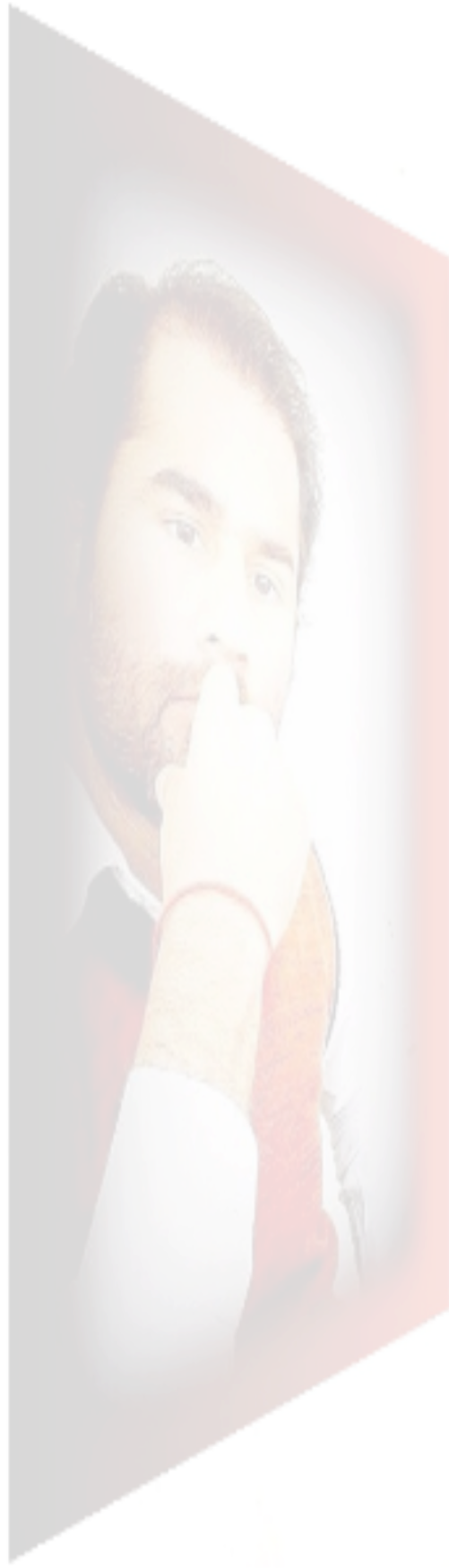
شکستِ اعتمادِ جاں کا بدلا چاہتا ہوں
وہ دھوکا تھا تو اس دھوکے کا چرچا چاہتا ہوں

نہ جانے کون سی اُفتاد سر پر آ پڑی ہے
سمندر ہوں مگر صحرا میں رہنا چاہتا ہوں

سگانِ کوچۂ شہرت کو مژدہ ہو کہ میں خود
گلی کوچوں میں تشہیرِ تمنا چاہتا ہوں

زمانہ ہوگیا خود سے مجھے لڑتے جھگڑتے
میں اپنے آپ سے اَب صُلح کرنا چاہتا ہوں

کہاں کا خیر، کیسی حُرمتِ لفظ و معانی
میں دُنیا میں ہوں اور اسبابِ دُنیا چاہتا ہوں

خواب دیکھنے والی آنکھیں پتھر ہوں گی تب سوچیں گے
سندر کومل دھیان تتلیاں بے پر ہوں گی تب سوچیں گے

رس برسانے والے بادل اور طرف کیوں اڑ جاتے ہیں
ہری بھری شاداب کھیتیاں بنجر ہوں گی تب سوچیں گے

بستی کی دیوار پہ کس نے ان ہونی باتیں لکھ دی ہیں
اس ان جانے ڈر کی باتیں گھر گھر ہوں گی تب سوچیں گے

مانگے کے پھولوں سے کب تک روپ سروپ کا مان بڑھے گا
اپنے آنگن کی مہکاریں بے گھر ہوں گی تب سوچیں گے

بیتی رُت کی سب پہچانیں، بھول گئے تو پھر کیا ہوگا
گئے دنوں کی یادیں جب بے منظر ہوں گی تب سوچیں گے

آنے والے کل کا سواگت کیسے ہوگا کون کرے گا
جلتے ہوئے سورج کی کرنیں سر پر ہوں گی تب سوچیں گے

اہلِ محبّت کی مجبوری بڑھتی جاتی ہے
مٹی سے گلاب کی دُوری بڑھتی جاتی ہے

خرابوں سے محل سرا تک ڈھیروں ڈھیر چراغ
جلتے جاتے ہیں بے نوری بڑھتی جاتی ہے

کاروبار میں اب کے خسارہ اور طرح کا ہے
کام نہیں بڑھتا مزدوری بڑھتی جاتی ہے

جیسے جیسے جسم تشفّی پاتا جاتا ہے
ویسے ویسے قلب سے دُوری بڑھتی جاتی ہے

گریۂ نیم شبی کی نعمت جب سے بحال ہوئی
ہر لحظہ اُمیدِ حضوری بڑھتی جاتی ہے

منصب نہ کُلاہ چاہتا ہوں
تنہا ہوں گواہ چاہتا ہوں

اے اجرِ عظیم دینے والے!
توفیقِ گناہ چاہتا ہوں

میں شعلگیِ وجود کے بیچ
اک خطۂ سیاہ چاہتا ہوں

ڈرتا ہوں بہت بلندیوں سے
پستی سے نباہ چاہتا ہوں

وہ دِن کہ تجھے بھی بھول جاؤں
اُس دِن سے پناہ چاہتا ہوں

زرۂ صبر سے پیکانِ ستم کھینچتے ہیں
ایک منظر ہے کہ ہم دم ہمہ دم کھینچتے ہیں

شہر کے لوگ تو اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ مہر
اُن لکیروں سے عبارت ہے جو ہم کھینچتے ہیں

حکم ہوتا ہے تو سجدے میں جھکا دیتے ہیں سر
اِذن ملتا ہے تو شمشیرِ دو دم کھینچتے ہیں

ان ہی رستوں میں انھی خوں سے بھری گلیوں میں
کوئی دن اور کہ ہم لاشۂ جم کھینچتے ہیں

آشیانوں کو پلٹتے ہوئے طائرِ سرِشام
لوحِ اُمید پہ نقشِ غم و ہم کھینچتے ہیں

ہم فقیروں کو تو بس نامِ خدا کافی ہے
ہم کہاں منتِ اربابِ کَرَم کھینچتے ہیں

جن کی پرواز کے چرچے کبھی افلاک میں تھے
آنکھ جھپکی تھی کہ وہ عرش نشیں خاک میں تھے

جس پہ اب تہمتِ شب رنگ کے آوازے ہیں
کتنے سورج تھے کہ اس دامنِ صد چاک میں تھے

جانے کس وادیِ بے ابر کی قسمت ٹھہرے
ہائے وہ لوگ جو اس موسمِ سفاک میں تھے

جن سے دلداریِ جاناں کے قرینے یاد آئیں
ایسے تیور بھی مرے لہجۂ بے باک میں تھے

زرد پتّوں کی طرح خواب اُڑے پھرتے تھے
پھر بھی کچھ رنگ مرے دیدۂ نم ناک میں تھے

شہرِ بے رنگ! ترے لوگ گواہی دیں گے
ہم سے خوش رنگ بھی تیرے خس و خاشاک میں تھے

دُکھ اور طرح کے ہیں دُعا اور طرح کی
اور دامنِ قاتل کی ہوا اور طرح کی

دیوار پہ لکھی ہوئی تحریر ہے کچھ اور
دیتی ہے خبر خلقِ خدا اور طرح کی

کس دام اُٹھائیں گے خریدار کہ اِس بار
بازار میں ہے جنسِ وفا اور طرح کی

بس اور کوئی دِن کہ ذرا وقت ٹھہر جائے
صحراؤں سے آئے گی صدا اور طرح کی

ہم کُوئے ملامت سے نکل آئے تو ہم کو
راس آئی نہ پھر آب و ہوا اور طرح کی

تعظیم کر اے جانِ معانی کہ ترے پاس
ہم لائے ہیں سوغات ذرا اور طرح کی

شکستہ پر جنوں کو آزمائیں گے نہیں کیا
اُڑانوں کے لیے پر پھڑ پھڑائیں گے نہیں کیا

ہوائیں مہرباں تھیں منتقم کیوں ہو گئی ہیں
نگہ دارانِ ساحل کچھ بتائیں گے نہیں کیا

کوئی ہنستا ہوا سورج پسِ دیوارِ تاریک
فروزاں ہو تو دیواریں گرائیں گے نہیں کیا

وہ پہلی سی ارزانی سرِ بازارِ پندار
نظر آئے تو ہم قیمت بڑھائیں گے نہیں کیا

سوادِ تشنگی کے پار اک مواج دریا
غزل خواں ہو تو پھر تیشے اٹھائیں گے نہیں کیا

بدلتے موسموں کی ڈھول ہوتے راستوں کو
تھکے ہارے مسافر یاد آئیں گے نہیں کیا

غم جہاں کو شرمسار کرنے والے کیا ہوئے؟
وہ ساری عمر انتظار کرنے والے کیا ہوئے؟

بہم ہوئے بغیر جو گزر گئیں وہ ساعتیں
وہ ایک ایک پل شمار کرنے والے کیا ہوئے؟

دعائے نیم شب کی رسم کیسے ختم ہوگئی!
وہ حرفِ جاں پہ اعتبار کرنے والے کیا ہوئے؟

کہاں ہیں وہ جو دشتِ آرزو میں خاک ہوگئے
وہ لمحۂ ابد شکار کرنے والے کیا ہوئے؟

طلب کے ساحلوں پہ جلتی کشتیاں بتائیں گی
شناوری پہ اعتبار کرنے والے کیا ہوئے؟

بادل بادل گھومے پر گھر لوٹ کے آنا بھولے ناں
اللہ سائیں ڈار سے بچھڑی کونج ٹھکانا بھولے ناں

جب کبھی اُجلے اُجلے دِن پر ٹوٹ کے برسی کالی رات
ایک اپنی بستی کے نام کا دیا جلانا بھولے ناں

باغ بغیچے میرے جب جب نذر لہو کی چاہیں تو
میری برکت والی مٹی مجھے بلانا بھولے ناں

کھلیانوں کا سارا سونا ساری چاندی اس کی ہے
جان سے بھی جو ہریالی کا قرض چکانا بھولے ناں

لہروں سے پتواریں اُلجھیں آندھی بڑھتی ہی جائے
بیچ بھنور میں ناؤ کھیویا پار لگانا بھولے ناں

سدا جبیں مرے یار کہ سورج جن کا ماتھا چومے
اور ہوا جن کو میرا احوال سنانا بھولے ناں

زعمِ حشم و جبّہ و دستار بھی دیکھ آئیں
آئے ہیں کہ گرتی ہوئی دیوار بھی دیکھ آئیں

صحرا کو سمندر سے الگ کرتے ہوئے شہر
شہروں پہ لٹکتی ہوئی تلوار بھی دیکھ آئیں

کیا جانیے کیا دائرۂ ہجر کی ٹھیرے
مرکز سے الگ گردشِ پرکار بھی دیکھ آئیں

شاید کوئی تسکین کی صورت ہی نکل آئے
اچھا ہے کہ ارزانیِ پندار بھی دیکھ آئیں

دن بیت گئے بُرشِ شمشیر کو دیکھے
اندازِ گُل افشانیِ گفتار بھی دیکھ آئیں

خوش طالعیِ ماہ بھی اِک مہر کی پابند
بے مہریِ یارانِ طرح دار بھی دیکھ آئیں

یم بہ یم صف بہ صف چاہتے ہیں
سب نزولِ شرف چاہتے ہیں

بے جہت منزلوں کے مسافر
منزلیں ہر طرف چاہتے ہیں

رات کی گود میں پلنے والے
روشنی پر حلف چاہتے ہیں

بے محبت دماغوں کے بنجر
خشکیوں میں صدف چاہتے ہیں

اجنبی آستینوں کے خنجر
اپنے اپنے ہدف چاہتے ہیں

زندگی کے تسلسل سے کٹ کر
اعتبارِ سلف چاہتے ہیں

جیسا دِل ویسی ہی آرزوئیں
سنگ زادے خزف چاہتے ہیں

٭

نئے موسم کی خوشبو آزمانا چاہتی ہیں
کُھلی بانہیں سمٹنے کا بہانہ چاہتی ہیں

فصیلِ جسم کو ہر طور ڈھانا چاہتی ہیں
نمو کی خواہشیں اظہار پانا چاہتی ہیں

نئے آہو، نئے صحرا، نئے خوابوں کے امکان
نئی آنکھیں، نئے فتنے جگانا چاہتی ہیں

نگارِ شام بے منزل! بھٹکتی آرزوئیں
بسیرے کے لیے کوئی ٹھکانا چاہتی ہیں

بدن کے سر پھرے باغوں کی شوریدہ ہوائیں
نشاطِ گمرہی کے گیت گانا چاہتی ہیں

بدن کی آگ میں جلنے لگے ہیں پھول سے جسم
ہوائیں مشعلوں کی لو بڑھانا چاہتی ہیں

راتیں شور مچاتی ہیں
جانے کسے بلاتی ہیں

کیا کوئی رستہ بھول گیا
گلیاں خاک اڑاتی ہیں

مٹی کی سب تحریریں
مٹی میں مل جاتی ہیں

بادل، برسے جاتا ہے
بیلیں سوکھتی جاتی ہیں

آپ ہی آپ اندھیروں میں
تصویریں بن جاتی ہیں

سدا سمندر آنکھوں میں
یادیں پیاس بڑھاتی ہیں

کچھ دل سے کسی نے کہہ دیا پھر
وحشت کا چلے گا سلسلہ پھر

پھولوں پہ دھنک کی بارشیں ہیں
خوشبو سے ہوا ہے رابطہ پھر

بے نام رفاقتوں کا موسم
زخموں کے چمن کھلا گیا پھر

خوابوں سے ڈری ہوئی تھیں آنکھیں
ڈر ڈر کے کیا ہے حوصلہ پھر

آنکھیں تھیں اُداس مُسکرا دیں
پیاسا تھا بدن چھلک پڑا پھر

پتھراؤ سے کب تلک بچیں گے
پھر ٹوٹ گیا جو آئنہ پھر

پھر شہر کے سارے داستاں گو
دُہرائیں گے ایک واقعہ پھر

سجل کہ شور زمینوں میں آشیانہ کرے
نہ جانے اب کے مسافر کہاں ٹھکانا کرے

بس ایک بار اُسے پڑھ سکوں غزل کی طرح
پھر اس کے بعد تو جو گردشِ زمانہ کرے

ہوائیں وہ ہیں کہ ہر زُلف پیچ دار ہوئی
کسے دماغ کہ اب آرزوئے شانہ کرے

ابھی تو رات کے سب نگہ دار جاگتے ہیں
ابھی سے کون چراغوں کی لَو نشانہ کرے

سلوک میں بھی وہی تذکرے وہی تشہیر
کبھی تو کوئی اک احسان غائبانہ کرے

میں سب کو بھول گیا زخمِ مندمل کی مثال
مگر وہ شخص کہ ہر بات جارحانہ کرے

یہ اب کھُلا کہ کوئی بھی منظر مرا نہ تھا
میں جس میں رہ رہا تھا وہی گھر مرا نہ تھا

میں جس کو ایک عمر سنبھالے پھرا کیا
مٹی بتا رہی ہے وہ پیکر مرا نہ تھا

موجِ ہوائے شہرِ مقدر جواب دے
دریا مرے نہ تھے کہ سمندر مرا نہ تھا

پھر بھی تو سنگسار کیا جا رہا ہوں میں
کہتے ہیں نام تک سرِ محضر مرا نہ تھا

سب لوگ اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ تھے
اک میں ہی تھا کہ کوئی بھی لشکر مرا نہ تھا

زمیں پیروں میں، سر پر آسماں نئیں
مگر ہم ہیں کہ احساسِ زیاں نئیں

گھروں میں، راستوں میں، منزلوں پر
شکستہ پائی کا نوحہ کہاں نئیں

ق

ردائے وسعتِ صحرا گریزاں
دوانے کو کہیں جائے اماں نئیں

جوابِ تنگیِ صحرا سمندر
سمندر بھی کچھ ایسا مہرباں نئیں

ہوا کے رُخ پہ اُڑتی پھر رہی ہے
وہ اِک کشتی کہ جس پر بادباں نئیں

خزاں چہرے گواہی دے رہے ہیں
دلِ پُرخوں، ترا درماں یہاں نئیں

طنابِ خیمۂ گُل کاٹ دی جب
سو شکوہ کیا کہ سر پر سائباں نئیں

یہ معجزہ بھی کسی کی دُعا کا لگتا ہے
یہ شہر اب بھی اُسی بے وفا کا لگتا ہے

یہ تیرے میرے چراغوں کی ضد جہاں سے چلی
وہیں کہیں سے علاقہ ہوا کا لگتا ہے

دل ان کے ساتھ مگر تیغ اور شخص کے ساتھ
یہ سلسلہ بھی کچھ اہلِ ریا کا لگتا ہے

نئی گرہ نئے ناخن نئے مزاج کے قرض
مگر یہ پیچ بہت ابتدا کا لگتا ہے

کہاں میں اور کہاں فیضانِ نغمہ و آہنگ
کرشمہ سب در و بستِ نوا کا لگتا ہے

کسی اہلِ ہجر کی بد دعا ہے کہ خود سری کا قصور ہے
یہ جو بات بن کے بگڑ رہی ہے تو کوئی بات ضرور ہے

وہ عجیب رات تھی سارے شہر میں اِک چراغ نہیں جلا
مگر اک لکیر لہو کی ایسی کھنچی کہ نور ہی نور ہے

میں بس ایک بار گیا تھا کوئے وصال میں مگر اس کے بعد
وہ بدن کے بھید کُھلے کہ اب نہ حجاب ہے نہ حضور ہے

یہ عجیب لوگ ہیں جن کے بیچ بکھر رہی ہے متاعِ عمر
نہ کسی پہ گردِ جُنون ہے نہ کہیں غبارِ شعور ہے

مری بے گھری مجھے کیسے کیسے دروں گھروں پہ لیے پھری
مرا واہمہ تھا کہ میرے رختِ سفر میں جوہرِ نور ہے

میں چراغ لے کے ہوا کی زد پہ جو آ گیا ہوں تو غم نہ کر
میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ہاتھ پہ ایک ہاتھ ضرور ہے

Imagitor

کس قیامت خیز چپ کا زہر سناٹے میں ہے
میں جو چیخا ہوں تو سارا شہر سناٹے میں ہے

ایک کے بعد ایک مُہرہ پٹتا جاتا ہے وقت
پھر بساطِ اعتبارِ دہر سناٹے میں ہے

ایک اک کر کے ستارے ڈوبتے جاتے ہیں کیوں
جاگتی راتوں کا پچھلا پہر سناٹے میں ہے

بادبانوں سے ہوا اُلجھی تو ساحل چپ رہا
ناؤ ڈوبی ہے تو اب ہر لہر سناٹے میں ہے

رو رہا ہوں میں کہ خاموشی مقدر ہو گئی
لوگ ہنستے ہیں کہ میرا شہر سناٹے میں ہے

پھر فضاؤں میں وہی مسموم آوازوں کی گونج
کیا بتائیں کیسا کاری زہر سناٹے میں ہے

دیدنی ہے وحشتِ اولادِ آدم اِن دنوں!
آسمانوں پر خدا کا قہر سناٹے میں ہے
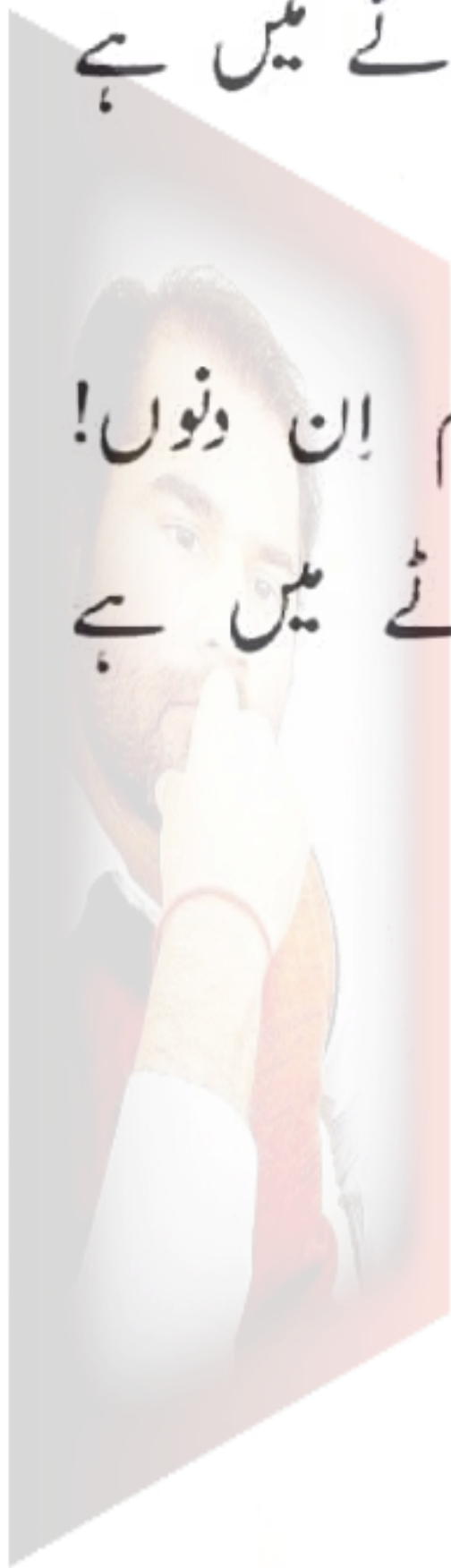
ملکِ سخن میں درد کی دولت کو کیا ہوا
اے شہرِ میر! تیری روایت کو کیا ہوا

ہم تو سدا کے بندۂ زر تھے ہمارا کیا
نام آورانِ عہدِ بغاوت کو کیا ہوا

گرد و غبارِ کوچۂ شہرت میں آ کے دیکھ
آسودگانِ کنجِ قناعت کو کیا ہوا

گھر سے نکل کے بھی وہی تازہ ہوا کا خوف
میثاقِ ہجر! تیری بشارت کو کیا ہوا

اک چہرہ منکشف ہوا ایسا کہ ساری عمر
آئینے پوچھتے رہے حیرت کو کیا ہوا

سارے دیے بجھا گئی اک بادِ بے لحاظ
کیا پوچھنا کہ شہرِ محبت کو کیا ہوا

منظر سے ہیں نہ دیدۂ بینا کے دَم سے ہیں
سب معجزے طلسمِ تماشا کے دَم سے ہیں

مٹی تو سامنے کا حوالہ ہے اور بس
کوزے میں جتنے رنگ ہیں دریا کے دَم سے ہیں

کیا ایسی منزلوں کے لیے نقدِ جاں گنوائیں
جو خود ہمارے نقشِ کفِ پا کے دَم سے ہیں

یہ ساری جنّتیں یہ جہنم، عذاب و اجر
ساری قیامتیں اسی دُنیا کے دَم سے ہیں

ہم سارے یادگارِ زمین و زمانہ لوگ
اک صاحبِ زمین و زمانہ کے دَم سے ہیں

وحشت کا اثر خواب کی تعبیر میں ہوتا
اک جاگنے والا مری تقدیر میں ہوتا

اک عالمِ خوبی ہے میسّر مگر اے کاش
اُس گل کا علاقہ مری جاگیر میں ہوتا

اُس آہوئے رَم خوردہ و خوش چشم کی خاطر
اک حلقۂ خوشبو مری زنجیر میں ہوتا

مہتاب میں اک چاند سی صورت نظر آتی
نسبت کا شرف سلسلۂ میرؔ میں ہوتا

مرتا بھی جو اُس پر تو اُسے مار کے رکھتا
غالبؔ کا چلن عشق کی تقصیر میں، ہوتا

اک قامتِ زیبا کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہے
ہوتا تو مرے حرفِ گرہ گیر میں ہوتا

پسِ گردِ جادۂ دردِ نور کا قافلہ بھی تو دیکھتے
جو دلوں سے ہوکے گزر رہا ہے وہ راستہ بھی تو دیکھتے

یہ دھواں جو ہے یہ کہاں کا ہے وہ جو آگ تھی وہ کہاں کی تھی
کبھی راویانِ خبر زدہ پسِ واقعہ بھی تو دیکھتے

یہ گلو گرفتہ و بستۂ رسنِ جفا، مرے ہم قلم!
کبھی جابروں کے دلوں میں خوفِ مکالمہ بھی تو دیکھتے

یہ جو پتھروں میں چھپی ہوئی ہے شبیہ یہ بھی کمال ہے
وہ جو آئنے میں ہمک رہا ہے وہ معجزہ بھی تو دیکھتے

جو ہوا کے رُخ پہ کھُلے ہوئے ہیں وہ بادباں تو نظر میں ہیں
وہ جو موجِ خوں سے الجھ رہا ہے وہ حوصلہ بھی تو دیکھتے

یہ جو آبِ زر سے رقم ہوئی ہے یہ داستان بھی مستند
وہ جو خونِ دل سے لکھا گیا ہے وہ حاشیہ بھی تو دیکھتے

میں تو خاک تھا کسی چشمِ ناز میں آ گیا ہوں تو مہر ہوں
مرے مہرباں کبھی اک نظر مرا سلسلہ بھی تو دیکھتے
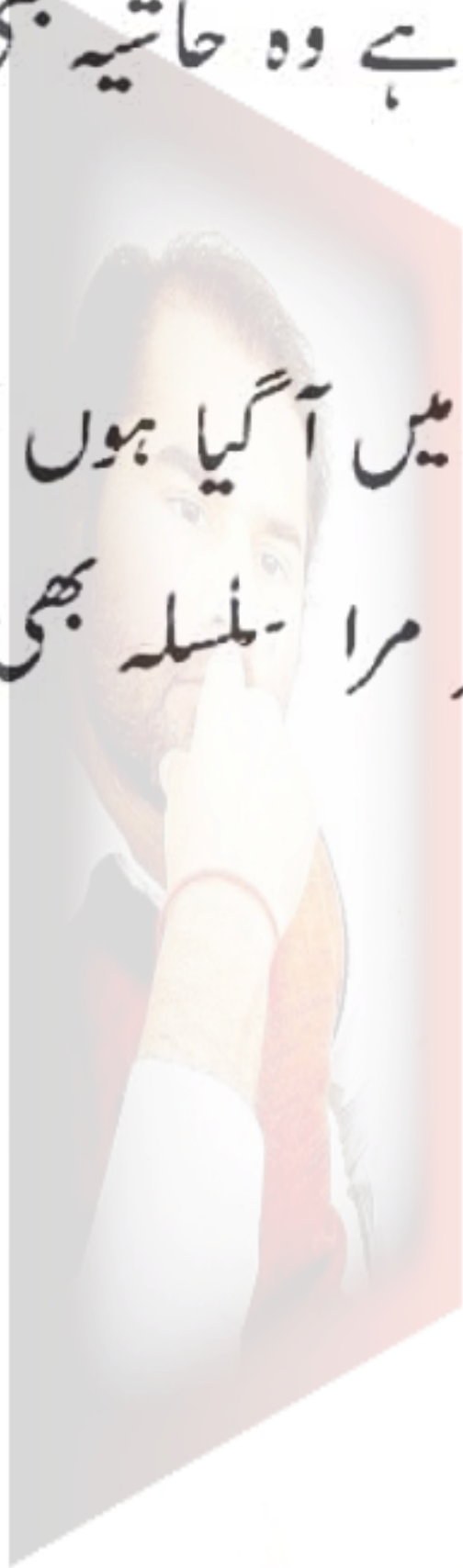
سخنِ حق کو فضیلت نہیں ملنے والی
صبر پر دادِ شجاعت نہیں ملنے والی

وقتِ معلوم کی دہشت سے لرزتا ہوا دل
ڈوبا جاتا ہے کہ مہلت نہیں ملنے والی

زندگی نذر گزاری تو ملی چادرِ خاک
اس سے کم پر تو یہ نعمت نہیں ملنے والی

راس آنے لگی دنیا تو کہا دل نے کہ جا!
اب تجھے درد کی دولت نہیں ملنے والی

ہوسِ لقمۂ تر کھا گئی لہجے کا جلال
اب کسی حرف کو حرمت نہیں ملنے والی

گھر سے نکلے ہوئے بیٹوں کا مقدر معلوم
ماں کے قدموں میں بھی جنت نہیں ملنے والی

زندگی بھر کی کمائی یہی مصرعے دو چار
اس کمائی پہ تو عزت نہیں ملنے والی

امید و بیم کے محور سے ہٹ کے دیکھتے ہیں
ذرا سی دیر کو دنیا سے کٹ کے دیکھتے ہیں

بکھر چکے ہیں بہت باغ و دشت و دریا میں
اب اپنے حجرۂ جاں میں سمٹ کے دیکھتے ہیں

تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات
سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کے دیکھتے ہیں

پھر اس کے بعد جو ہونا ہے ہو رہے سرِ دست
بساطِ عافیتِ جاں اُلٹ کے دیکھتے ہیں

وہی ہے خواب جسے مل کے سب نے دیکھا تھا
اب اپنے اپنے قبیلوں میں بٹ کے دیکھتے ہیں

سنا یہ ہے کہ سبک ہو چلی ہے قیمتِ حرف
سو ہم بھی اب قد و قامت میں گھٹ کے دیکھتے ہیں

جیسا ہوں ویسا کیوں ہوں سمجھا سکتا تھا میں
تم نے پوچھا تو ہوتا بتلا سکتا تھا میں

آسودہ رہنے کی خواہش مار گئی، ورنہ
آگے اور بہت آگے تک جا سکتا تھا میں

چھوٹی موٹی ایک لہر ہی تھی میرے اندر
ایک لہر سے کیا طوفان اُٹھا سکتا تھا میں

کہیں کہیں سے کچھ مصرعے ایک آدھ غزل، کچھ شعر
اس پونجی پر کتنا شور مچا سکتا تھا میں

جیسے سب لکھتے رہتے ہیں غزلیں، نظمیں، گیت
ویسے لکھ لکھ کر انبار اگا سکتا تھا میں

غبارِ دشتِ طلب زیادہ ہے تو جنوں میں زیادہ ہو جا
مہارِ ناقہ کو پشتِ ناقہ پہ ڈال دے پاپیادہ ہو جا

بس ایک ہی راستہ ہے دنیا کو زیر کرنے کا، جیتنے کا
یہ جتنی پُر پیچ ہوتی جائے اُسی قدر سہل و سادہ ہو جا

یہ میرا ذمہ کہ خود تری منزلیں تعاقب کریں گی تیرا
بس ایک محمل کو دیکھ اور بے نیازِ ہر رخت و جادہ ہو جا

وہ جس کے ادنیٰ سے اک اشارے پہ مہر و مہتاب جاگتے ہیں
اسی کے قدموں پہ اپنی مرضی کو ڈال دے، بے ارادہ ہو جا

اور اس سے پہلے کہ چشمِ بینا سے تابِ نظارہ چھین لی جائے
قریب کے منظروں میں زنجیرِ ذہن کچھ تو کشادہ ہو جا

ملے تو کیسے ملے منزلِ خزینۂ خواب
کہاں دمشقِ مقدر کہاں مدینۂ خواب

سیاہ خانۂ خوف و ہراس میں اک شخص
سنا رہا ہے مسلسل حدیثِ زینۂ خواب

یقیں کا ورد و وظیفہ نہ اسمِ اعظمِ عشق
تو پھر یہ کیسے کھلے گا طلسمِ سینۂ خواب

جہاں جہاں کی بھی مٹی ہمیں پسند آئی
وہاں وہاں پہ امانت کیا دفینۂ خواب

خروشِ گریۂ بے اختیار ایسا تھا
تڑخ کے ٹوٹ گیا رات آبگینۂ خواب

شکستِ خوابِ گزشتہ پہ نوحہ خوانی ہوئی
پھر اس کے بعد بجی محفلِ شبینۂ خواب

میسر آئی ہے توفیقِ شعر — خوش ہولیں
نہ پھر یہ سیلِ رواں ہے نہ یہ سفینۂ خواب

انیسؔ و آتشؔ و اقبالؔ سے مسلسل ہے
یہ سادہ کاری، یہ صنّاعیِ نگینۂ خواب

مرے خدا مرے لفظ و بیاں میں ظاہر ہو
اِسی شکستہ و بستہ زباں میں ظاہر ہو

زمانہ دیکھے مرے حرفِ باریاب کے رنگ
گلِ مرادِ ہنر دشتِ جاں میں ظاہر ہو

میں سرخرو نظر آؤں، کلام ہو کہ سکوت
تری عطا مرے نام و نشاں میں ظاہر ہو

مزہ تو جب ہے کہ اہلِ یقیں کا سرِّ کمال
ملامتِ سخنِ گُمرہاں میں ظاہر ہو

گزشتگانِ محبت کا خوابِ گم گشتہ
عجب نہیں شبِ آئندگاں میں ظاہر ہو

پسِ حجاب ہے اک شہسوارِ وادیِ نور
کسے خبر اِسی عہدِ زیاں میں ظاہر ہو

میرا مالک جب توفیق ارزانی کرتا ہے
گہرے زرد زمین کی رنگت دھانی کرتا ہے

بجھتے ہوئے دیے کی لو اور بھیگی آنکھ کے بیچ
کوئی تو ہے جو خوابوں کی نگرانی کرتا ہے

مالک سے اور مٹی سے اور ماں سے باغی شخص
درد کے ہر میثاق سے رُوگردانی کرتا ہے

یادوں سے اور خوابوں سے اور اُمیدوں سے ربط
ہو جائے تو جینے میں آسانی کرتا ہے

کیا جانے کب کس ساعت میں طبع رواں ہو جائے
یہ دریا بے موسم بھی طغیانی کرتا ہے

دل پاگل ہے روز نئی نادانی کرتا ہے
آگ میں آگ ملاتا ہے پھر پانی کرتا ہے

شہرِ گل کے خس و خاشاک سے خوف آتا ہے
جس کا وارث ہوں اُسی خاک سے خوف آتا ہے

شکل بننے نہیں پاتی کہ بگڑ جاتی ہے
نئی مٹی کو نئے چاک سے خوف آتا ہے

وقت نے ایسے گھمائے افق، آفاق کہ بس
محورِ گردشِ سفاک سے خوف آتا ہے

یہی لہجہ تھا کہ معیارِ سخن ٹھہرا تھا
اب اسی لہجۂ بے باک سے خوف آتا ہے

آگ جب آگ سے ملتی ہے تو لَو دیتی ہے
خاک کو خاک کی پوشاک سے خوف آتا ہے

قامتِ جاں کو خوش آیا تھا کبھی خلعتِ عشق
اب اسی جامۂ صد چاک سے خوف آتا ہے

کبھی اَفلاک سے نالوں کے جواب آتے تھے
اِن دنوں عالمِ افلاک سے خوف آتا ہے

رحمتِ سیدِؐ لولاک پہ کامل ایمان
اُمتِ سیدِؐ لولاک سے خوف آتا ہے

خزانۂ زر و گوہر پہ خاک ڈال کے رکھ
ہم اہلِ مہر و محبت ہیں، دل نکال کے رکھ

ہمیں تو اپنے سمندر کی ریت کافی ہے
تو اپنے چشمۂ بے فیض کو سنبھال کے رکھ

ذرا سی دیر کا ہے یہ عروجِ مال و منال
ابھی سے ذہن میں سب زاویے زوال کے رکھ

یہ بار بار کنارے پہ کس کو دیکھتا ہے
بھنور کے بیچ کوئی حوصلہ اچھال کے رکھ

نہ جانے کب تجھے جنگل میں رات پڑ جائے
خود اپنی آگ سے شعلہ کوئی اچھال کے رکھ

جواب آئے نہ آئے سوال اُٹھا تو سہی
پھر اُس سوال میں پہلو نئے سوال کے رکھ

تری بلا سے گروہِ جنوں پہ کیا گزری
تو اپنا دفترِ سود و زیاں سنبھال کے رکھ

چھلک رہا ہے جو کشکولِ آرزو، اس میں
کسی فقیر کے قدموں کی خاک ڈال کے رکھ

مری مٹی سے مرے خوابوں کے رشتے محکم کرنے کے لیے
اک درد مسلسل جاگتا ہے دل و جاں کو بہم کرنے کے لیے

جہاں وحشت کرنا سیکھا تھا جہاں جاں سے گزرنا سیکھا تھا
مرے آہو مجھے بلاتے ہیں اُسی دشت میں رَم کرنے کے لیے

وہ جو اوّل عشق کی شدت تھی وہ تو مہرِ دونیم کی نذر ہوئی
اب پھر اک موسم آیا ہے مجھے مستحکم کرنے کے لیے

یہ سارے ادب آدابِ ہنر یوں ہی تو نہیں آجاتے ہیں
عمریں تج دینی پڑتی ہیں اک حرف رقم کرنے کے لیے

موت آئی اور دل کی دہلیز پہ بوسہ دے کر لوٹ گئی
مرے مہمان آئے بیٹھے تھے مجھے تازہ دم کرنے کے لیے

مرے مالک! مجھ کو غنی کر دے کہ شکست کے بعد مرا دشمن
مری تیغ کا طالب ہے مجھ سے مرے ہاتھ قلم کرنے کے لیے

اُنھیں میں جیتے اِنھیں بستیوں میں مر رہتے
یہ چاہتے تھے مگر کس کے نام پر رہتے

پیمبروں سے زمینیں وفا نہیں کرتیں
ہم ایسے کون خدا تھے کہ اپنے گھر رہتے

پرندے جاتے نہ جاتے پلٹ کے گھر اپنے
پر اپنے ہم شجروں سے تو باخبر رہتے

بس ایک خاک کا احسان ہے کہ خیر سے ہیں
وگرنہ صورتِ خاشاک در بدر رہتے

مرے کریم! جو تیری رضا مگر اِس بار
برس گزر گئے شاخوں کو بے ثمر رہتے

قلم جب دِرہم و دِینار میں تولے گئے تھے
کہاں تک دل کی چنگاری، ترے شعلے گئے تھے

فصیلِ شہرِ لب بستہ! گواہی دے کہ کچھ لوگ
دہانِ حلقۂ زنجیر سے بولے گئے تھے

تمام آزاد آوازوں کے چہرے گرد ہو جائیں
فضاؤں میں کچھ ایسے زہر بھی گھولے گئے تھے

فسادِ خون سے سارا بدن تھا زخم ہی زخم
سو نشتر سے نہیں شمشیر سے کھولے گئے تھے

وہ خاکِ پاک ہم اہلِ محبت کو ہے اکسیر
سرِ مقتل جہاں نیزوں پہ سر تولے گئے تھے

ہر اک سیلِ بلا، ایک اک شناور سامنے ہے
کنارے ہوں مگر سارا سمندر سامنے ہے

اک آئینہ اور اتنے مسخ چہرے اور بیک وقت
بجھی جاتی ہیں آنکھیں اب وہ منظر سامنے ہے

نہیں معلوم اب اِس خواب کی تعبیر کیا ہو
میں نرغے میں ہوں اور جلتا ہوا گھر سامنے ہے

سوالِ حرمتِ میزانِ بے توقیر کے بعد
جو زیرِ آستیں تھا اب وہ خنجر سامنے ہے

ابھی جو اہتمامِ جشنِ فردا میں مگن تھی
وہی خلقِ خدا حیران و ششدر سامنے ہے

فریب کھا کے بھی اک منزلِ قرار میں ہیں
وہ اہلِ ہجر کہ آسیبِ اعتبار میں ہیں

زمین جن کے لیے بوجھ تھی وہ عرش مزاج
نہ جانے کون سے محور پہ، کس مدار میں ہیں

پرانے درد، پرانی محبتوں کے گلاب
جہاں بھی ہیں خس و خاشاک کے حصار میں ہیں

اڑائی تھی جو گروہِ ہوس نہاد نے دھول
تمام منزلیں اب تک اُسی غبار میں ہیں

نہ جانے کون سی آنکھیں وہ خواب دیکھیں گی
وہ ایک خواب کہ ہم جس کے انتظار میں ہیں

چراغ کون سے بجھنے ہیں کن کو رہنا ہے
یہ فیصلے ابھی اوروں کے اختیار میں ہیں

گلی کوچوں میں ہنگامہ بپا کرنا پڑے گا
جو دل میں ہے اب اُس کا تذکرہ کرنا پڑے گا

نتیجہ کربلا سے مختلف ہو یا وہی ہو
مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑے گا

وہ کیا منزل جہاں سے راستے آگے نکل جائیں
سو اب پھر اک سفر کا سلسلہ کرنا پڑے گا

لہو دینے لگی ہے چشمِ خوں بستہ سو اِس بار
بھری آنکھوں سے خوابوں کو رِہا کرنا پڑے گا

مبادا! قصۂ اہل جنوں ناگفتہ رہ جائے
نئے مضمون کا لہجہ نیا کرنا پڑے گا

درختوں پر ثمر آنے سے پہلے آئے تھے پھول
پھلوں کے بعد کیا ہوگا پتا کرنا پڑے گا

گنوا بیٹھے تری خاطر ہم اپنے مہر و مہتاب
بتا! اب اے زمانے اور کیا کرنا پڑے گا
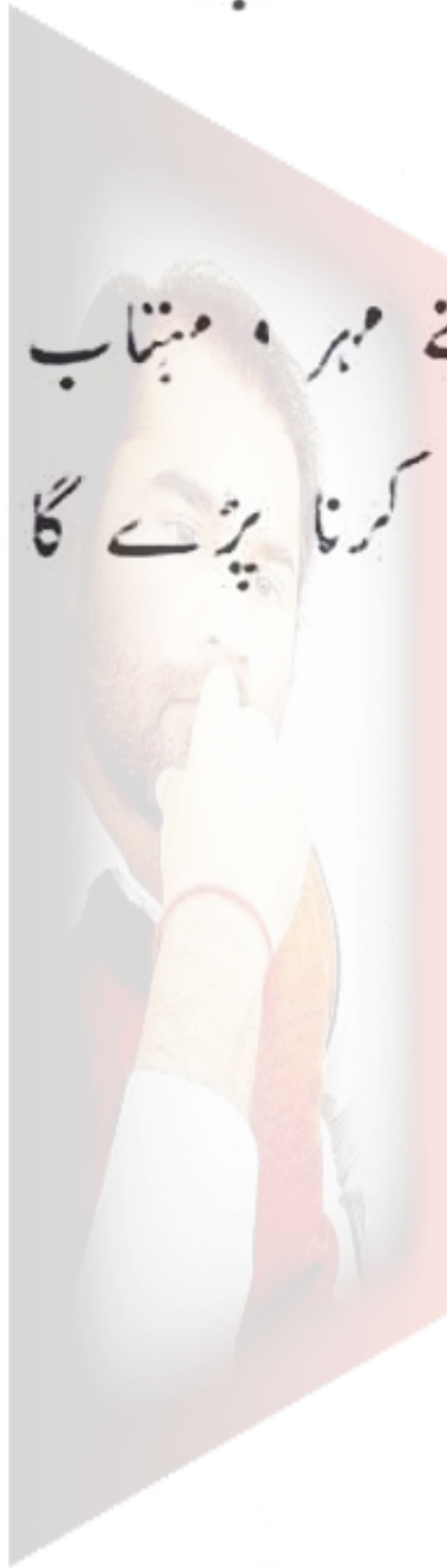
مالک! یہ آب و خرما یہ نان و نمک نہ دے
تیری رضا نہ ہو تو مجھے خاک تک نہ دے

بس ایک خواب جس کی حدیں دسترس میں ہوں
وہ بھی نہ دے، پہ خواب فلک در فلک نہ دے

میں کیا کروں گا جان کے اَسرارِ کائنات
مجھ کم نظر کو سِرِّ سما و سمک نہ دے

کچھ نام جانتا ہوں، وہ کافی ہیں اور بس
یہ ساتھ ہیں تو کچھ ابد آباد تک نہ دے

وردِ زباں رہیں انھیں نورانیوں کے نام
جب تک یہ خاک چادرِ امکان ڈھک نہ دے

وفا کی خیر مناتا ہوں بے وفائی میں بھی
میں اُس کی قید میں ہوں قید سے رہائی میں بھی

لہو کی آگ میں جل بجھ گئے بدن تو کھُلا
رسائی میں بھی خسارہ ہے نارسائی میں بھی

بدلتے رہتے ہیں موسم گزرتا رہتا ہے وقت
مگر یہ دل کہ وہیں کا وہیں جدائی میں بھی

لحاظِ حرمتِ پیماں نہ پاسِ ہم خوابی
عجب طرح کے تصادم تھے آشنائی میں بھی

میں دس برس سے کسی خواب کے عذاب میں ہوں
وہی عذاب در آیا ہے اس دہائی میں بھی

تصادمِ دل و دنیا میں دل کی ہار کے بعد
حجاب آنے لگا ہے غزل سرائی میں بھی

میں جا رہا ہوں اب اس کی طرف اُسی کی طرف
جو میرے ساتھ تھا میری شکستہ پائی میں بھی
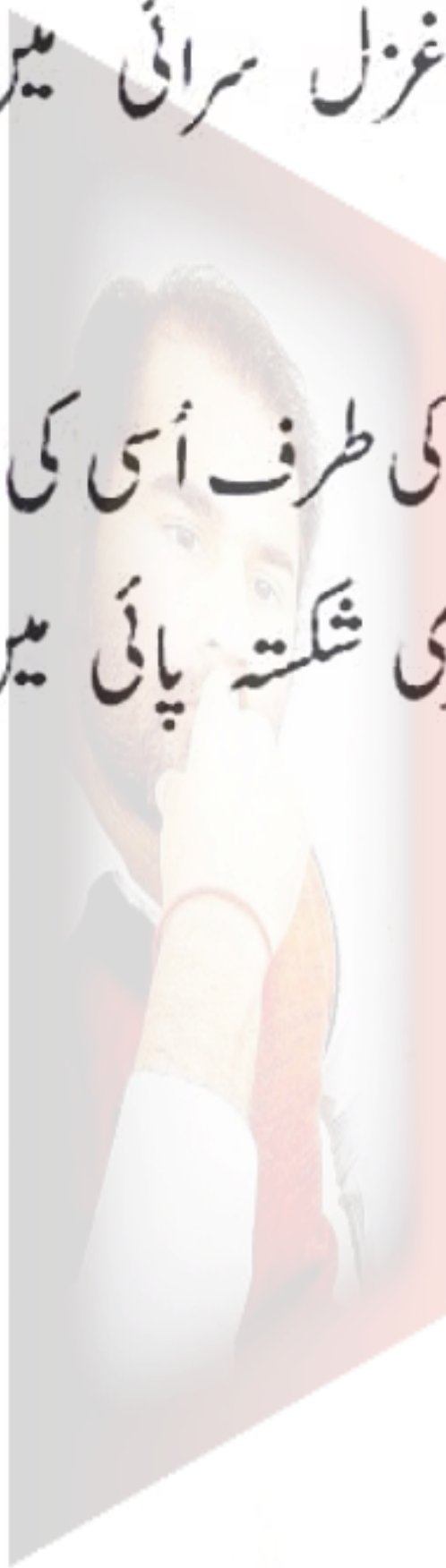
روش میں گردشِ سیارگاں سے اچھی ہے
زمیں کہیں کی بھی ہو آسماں سے اچھی ہے

جو حرفِ حق کی حمایت میں ہو وہ گم نامی
ہزار وضع کے نام و نشاں سے اچھی ہے

عجب نہیں کل اُسی کی زبان کھینچی جائے
جو کہہ رہا ہے خموشی زباں سے اچھی ہے

بس ایک خوف کہیں دل یہ بات مان نہ جائے
یہ خاکِ غیر ہمیں آشیاں سے اچھی ہے

ہم ایسے گل زدگاں کو بہارِ یک ساعت
نگار خانۂ عہدِ خزاں سے اچھی ہے

سرِ بامِ ہجر دیا بجھا تو خبر ہوئی
سرِ شام کوئی جدا ہوا تو خبر ہوئی

مرا خوش خرام بلا کا تیز خرام تھا
مری زندگی سے چلا گیا تو خبر ہوئی

مرے سارے حرف تمام حرف عذاب تھے
مرے کم سخن نے سخن کیا تو خبر ہوئی

کوئی بات بن کے بگڑ گئی تو پتا چلا
مرے بے وفا نے کرم کیا تو خبر ہوئی

مرے ہم سفر کے سفر کی سمت ہی اور تھی
کہیں راستہ کوئی گم ہوا تو خبر ہوئی

مرے قصہ گو نے کہاں کہاں سے بڑھائی بات
مجھے داستاں کا سِرا ملا تو خبر ہوئی

نہ لہو کا موسمِ رنگ ریز، نہ دل، نہ میں!
کوئی خواب تھا کہ بکھر گیا تو خبر ہوئی
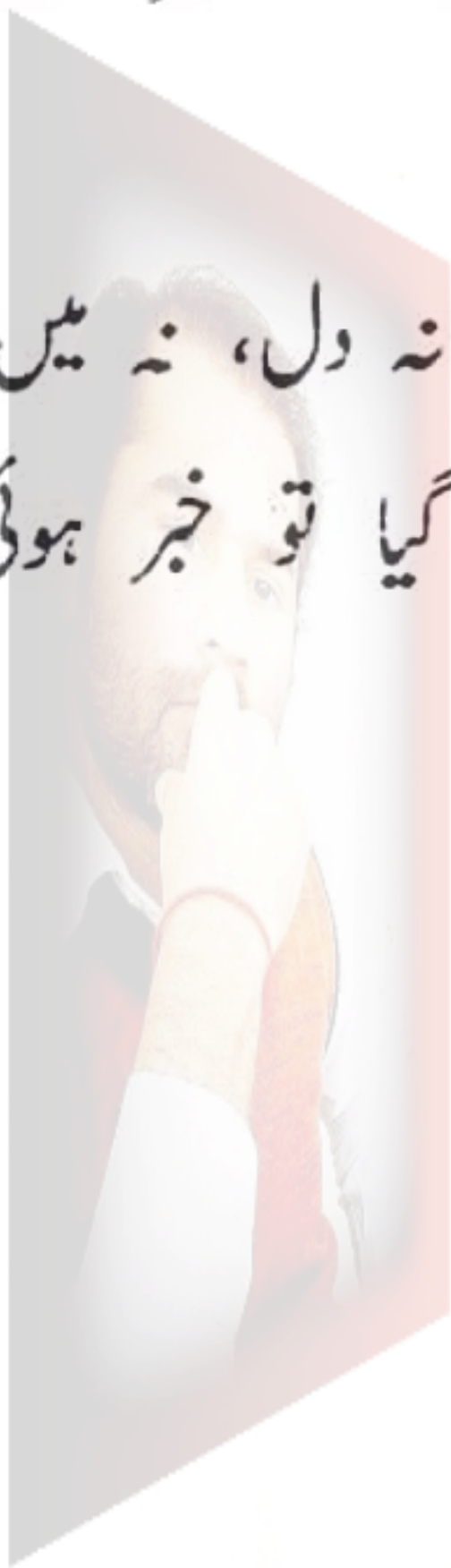
مرا ہر لفظ بے توقیر رہنے کے لیے ہے
مرا ہر خوف دامن گیر رہنے کے لیے ہے

میں جس شہرِ جمال آثار کا مارا ہوا ہوں
وہ سارا شہر بے تعمیر رہنے کے لیے ہے

میں ایسے خواب کی پاداش میں معتوب ٹھہرا
جو ساری عمر بے تعبیر رہنے کے لیے ہے

ذرا سی دیر میں، بجھ جائیں گے سب مہر و مہتاب
یہ دعویٰ کیا کہ ہر تنویر رہنے کے لیے ہے

ذرا سی دیر میں دھندلا کے رہ جائے گا ہر نقش
گماں یہ تھا کہ ہر تصویر رہنے کے لیے ہے

نہ میری آگ کی یہ شعلگی باقی رہے گی
نہ میری خاک کی تاثیر رہنے کے لیے ہے

نہ یہ آب و ہوائے شہرِ جسم و جاں دوامی
نہ میرے درد کی جاگیر رہنے کے لیے ہے

نہ اقلیمِ ہنر میں عظمتِ غالبؔ سلامت
نہ اعجازِ کلامِ میرؔ رہنے کے لیے ہے

کہیں محفوظ ہے لوحِ فنا پر ایک تحریر
بالآخر اِک وہی تحریر رہنے کے لیے ہے

جان میری! رات کے خیموں میں صبحیں ڈھونڈنے والوں کو پچھتانا پڑے گا
ایسا لگتا ہے بشارت کے نئے سورج لیے گھر کی طرف آنا پڑے گا

ہجر کی نامہرباں بستی میں ہر لحظہ بدلتے موسموں کے منظروں کو
آنکھ کا کیا ہے کہ یہ تسلیم کر ہی لے گی، لیکن دل کو سمجھانا پڑے گا

دل کے سرمائے کو نذرِ جاہ و منصب کر کے جب پلٹے تو جانا
وہ جو پونجی ڈوبنے والی ہے، ڈوبے ہی گی اوپر سے بھی ہرجانہ پڑے گا

قاتلوں کو مرحبا سننے کی عادت پڑ گئی ہے اب تو جانِ مصلحت کوش!
داد بھی ہر وار پر دینی پڑے گی اور جگر پر زخم بھی کھانا پڑے گا

آرزو کے ایک آئینے سے بھاگے تھے کہ اپنے آپ سے ڈرنے لگے تھے
کیا خبر تھی ہر گلی، ہر رہگزر کے موڑ پر اک آئنہ خانہ پڑے گا

کھیلنے میں ہارنے اور جیت جانے سے الگ بھی سو طرح کی وحشتیں ہیں
ہیں تو پھر کیا افتخار عارف کی صورت بے جیے ہی جان سے جانا پڑے گا

جہاں بھی رہنا ہمیں یہی اک خیال رکھنا
زمینِ فردا پہ سنگِ بنیادِ حال رکھنا

حضورِ اہلِ کمالِ فن سجدہ ریز رہنا
نگاہ میں طرۂ کلاہِ کمال رکھنا

وہ جس نے بخشی ہے بے نواؤں کو نعمتِ حرف
وہی سکھا دے گا حرف کو بے مثال رکھنا

اندھیری راتوں میں گریۂ بے سبب کی توفیق
میسر آئے تو غم کی دولت سنبھال رکھنا

سورج تھے چراغِ کفِ جادہ میں نظر آئے
ہم ایسے سمندر تھے کہ دریا میں نظر آئے

دنیا تھی رگ و پے میں سمائی ہوئی ایسی
ضد تھی کہ سبھی کچھ اِسی دنیا میں نظر آئے

سرمایۂ جاں لوگ، متاعِ دو جہاں لوگ
دیکھا تو سبھی اہلِ تماشا میں نظر آئے

خود دامنِ یوسف کی تمنا تھی کہ ہو چاک
اب کے وہ ہنرِ دستِ زلیخا میں نظر آئے

سیلِ جنوں ساحل کی جانب آتا ہے
خوابِ شبِ تاریک پہ غالب آتا ہے

ذرہ ہوں منسوب ہوا ہوں مہر کے ساتھ
روشن رہنا مجھ پر واجب آتا ہے

دل کی تباہی کے چھوٹے سے قصے میں
ذکرِ ہزار اطراف و جوانب آتا ہے

مٹی، پانی، آگ، ہوا سب اُس کے رفیق
جس کو اصولِ فرقِ مراتب آتا ہے

دل روئے اور گریے کی توفیق نہ ہو
ایسا وقت بھی عارفؔ صاحب آتا ہے

اب کے بچھڑا ہے تو کچھ ناشاداماں وہ بھی تو ہے
دھوپ ہم پر ہی نہیں بے سائباں وہ بھی تو ہے

شکوۂ بیدادِ موسم اُس سے کیجیے بھی تو کیوں
کیا کرے وہ بھی کہ زیرِ آسماں وہ بھی تو ہے

اور اب کیا چاہتے ہیں لوگ دیکھیں تو سہی
دربدر ہم ہی نہیں، بے خانماں وہ بھی تو ہے

ایک ہی دستک جہاں چونکائے رکھے ساری عمر
ایک اندازِ شکستِ جسم و جاں وہ بھی تو ہے

اس طرف بھی اک نظر اے رہروِ منزل نصیب
وہ جو منزل پر لٹا ہے کارواں وہ بھی تو ہے

شہرِ بے مہر سے پیمانِ وفا کیا باندھیں
خاک اڑتی ہے گُلِ تر کی ہوا کیا باندھیں

جانتے ہیں سفرِ شوق کی حد کیا ہو گی
زور باندھیں بھی تو ہم آبلہ پا کیا باندھیں

کوئی بولے گا تو آواز سنائی دے گی
ہُو کا عالم ہو تو مضمونِ صدا کیا باندھیں

ساری بستی ہوئی اک موجۂ سفاک کی نذر
اب کوئی بند سرِ سیلِ بلا کیا باندھیں

آخرش ہر نفسِ گرم کا انجام ہے ایک
سو گھڑی بھر کو طلسمِ من و ما کیا باندھیں

فضا میں رنگ نہ ہوں آنکھ میں نمی بھی نہ ہو
وہ حرف کیا کہ رقم ہو تو روشنی بھی نہ ہو

وہ کیا بہار کہ پیوندِ خاک ہو کے رہے
کشاکشِ روش و رنگ سے بَری بھی نہ ہو

کہاں ہے اور خزانہ بجز خزانۂ خواب
لٹانے والا لٹاتا رہے کمی بھی نہ ہو

یہی ہوا، یہی بے مہر و بے لحاظ ہوا
یہی نہ ہو تو چراغوں میں روشنی بھی نہ ہو

ملے تو مل لیے بچھڑے تو یاد بھی نہ رہے
تعلقات میں ایسی رواروی بھی نہ ہو

اور کا ذکر تو کیا میرؔ کا بھی سایہ نہ ہو
وہ سخن کر جو کسی اور نے فرمایا نہ ہو

خوں بہا میں تجھے دے دوں گا مگر دیکھ تو لے
قبضۂ تیغ پہ نقشِ کفِ ہمسایہ نہ ہو

یہ جو گھبرایا ہوا پھرتا ہے صحرا میں عقاب
اس کے پیچھے کوئی کنجشکِ فرومایہ نہ ہو

یہ رجز خواں — ہنرِ کاسہ و کشکول میں طاق
اپنی بنیاد میں پروردۂ سرمایہ نہ ہو

پسِ پردہ، یہ مزاحم، متصادم لہجہ
کہیں اظہارِ اطاعت ہی کا پیرایہ نہ ہو

غزل بعد از یگانہ سرخرو ہم سے رہے گی
مخاطب کوئی بھی ہو گفتگو ہم سے رہے گی

خس و خاشاک کی تقدیر ہے پامال رہنا
یہ پامالی جہاں کے روبرو ہم سے رہے گی

مثالِ سنگ تھے تب بھی یہ دل کہتا تھا ہم سے
دن آئیں گے کہ توقیرِ نمو ہم سے رہے گی

ہمیں کھینچیں گے فردِ بے دلی پر خطِ تنسیخ
تب و تابِ جہانِ آرزو ہم سے رہے گی

پرائی بستیوں میں زندگی کھونے کے باوصف
گھر آئیں گے تو ساری ہاؤ ہو ہم سے رہے گی

انیسؔ، آتشؔ، یگانہؔ! محرمانِ عالمِ حرف
اور اب اس سلسلے کی آبرو ہم سے رہے گی

ہم اہلِ جبر کے نام و نسب سے واقف ہیں
سروں کی فصل جب اُتری تھی تب سے واقف ہیں

کبھی چھپے ہوئے خنجر، کبھی کھنچی ہوئی تیغ
سپاہِ ظلم کے ایک ایک ڈھب سے واقف ہیں

وہ جن کی دستخطیں محضرِ ستم پہ ہیں ثبت
ہر اُس ادیب، ہر اُس بے ادب سے واقف ہیں

یہ رات یوں ہی تو دشمن نہیں ہماری کہ ہم
درازیِ شبِ غم کے سبب سے واقف ہیں

نظر میں رکھتے ہیں عصرِ بلند بامیِٔ مہر
فراتِ جبر کے ہر تشنہ لب سے واقف ہیں

کوئی نئی تو نہیں حرفِ حق کی تنہائی
جو جانتے ہیں وہ اس امرِ رب سے واقف ہیں

کسی کے جور و ستم یاد بھی نہیں کرتا
عجیب شہر ہے فریاد بھی نہیں کرتا

کوئی تو ہے جو پرندوں کو بال و پر دے کر
زمیں کی قید سے آزاد بھی نہیں کرتا

نہ جانے کیسی قیامت گزر گئی اب کے
غریب شکوۂ بیداد بھی نہیں کرتا

کبھی کبھی یہ گراں گوش چیخ پڑتا تھا
یہ کام اب مرا ہمزاد بھی نہیں کرتا

وہی صلیب و سلاسل، سکوت و سنگ زنی
نئے ستم کوئی ایجاد بھی نہیں کرتا

قیمتِ شوکتِ زر برسرِ بازار گری
جس کے ہر پیچ میں نخوت تھی وہ دستار گری

وقت کی تیغِ جگر دار پہ ہے عدل کا ہاتھ
آنکھ جھپکی تھی کہ چلتی ہوئی تلوار گری

ایک درویشِ خوشِ اقبال کے جانے کی تھی دیر
پھر تو وہ دھوپ کا بوجھ آیا کہ دیوار گری

کسی پندارِ شکستہ کا بھرم رہ تو گیا
اب یہ بات اور کہ خود قیمتِ پندار گری

خلق کی ضد تھی کہ سورج کی گواہی آئے
یک بیک خود مرے قدموں میں شبِ تار گری

جاہ و جلالِ دام و دِرم اور کتنی دیر
ریگِ رواں پہ نقشِ قدم اور کتنی دیر

اب اور کتنی دیر یہ دہشت، یہ ڈر، یہ خوف
گرد و غبارِ عہدِ ستم اور کتنی دیر

اب اور کتنی دیر یہ طبل و علَم کی دھوم
ذکرِ زوالِ لوح و قلم اور کتنی دیر

حلقہ بگوشوں، عرض گزاروں کے درمیان
یہ تمکنت، یہ زعمِ کرم اور کتنی دیر

پل بھر میں ہو رہے گا حسابِ نبود و بود
پیچ و خمِ وجود و عدم اور کتنی دیر

دامن کے سارے چاک، گریباں کے سارے چاک
ہو بھی گئے بہم تو بہم اور کتنی دیر

شام آ رہی ہے، ڈوبتا سورج بتائے گا
تم اور کتنی دیر ہو، ہم اور کتنی دیر

اک خوابِ دل آویز کی نسبت سے ملا کیا
جز دربدری اس درِ دولت سے ملا کیا

نان و نمک و وعدۂ دیوارِ تحفظ
دیوارِ تحفظ کی ضمانت سے ملا کیا

آشوبِ فراغت! ترے مجرم، ترے مجبور
کہہ بھی نہیں سکتے کہ فراغت سے ملا کیا

اک نغمہ کہ خود اپنے ہی آہنگ سے محجوب
اک عمر کے پندارِ سماعت سے ملا کیا

اِک نقش کہ خود اپنے ہی رنگوں سے ہراساں
آخر کو شب و روز کی وحشت سے ملا کیا

جاں دے کے بھی بالا نہ ہوئے نرخ ہمارے
بازارِ معانی میں مشقت سے ملا کیا

جیتا ہوا میدان کہ ہاری ہوئی بازی
اِس خانہ خرابی کی اذیت سے ملا کیا

اِک خلعتِ دشنام و کلاہِ سخنِ بد
شہرت تو بہت پائی پہ شہرت سے ملا کیا

دولتِ نغمہ و آہنگ و فغاں میری ہو
یہی دنیا یہی غارت گرِ جاں میری ہو

سینۂ ظلم میں ہونا ہے ترازو اک تیر
کاش ایسا ہو کہ اس بار کماں میری ہو

خلعت و مسند و دستار ملے جس کو ملے
خاکِ پاکِ درِ صاحب نظراں میری ہو

تھک کے جب بیٹھ رہے قافلۂ دل زدگاں
گردِ فردائے جہانِ گزراں میری ہو

مالک الملک جو چاہے تو یہ عزت مجھے دے
ایک دن مملکتِ لفظ و بیاں میری ہو

یہ جاہ و حشم نہیں رہے گا
یہ طبل و علم نہیں رہے گا

آئے گی ضرور آئے گی صبح
یہ عہدِ ستم نہیں رہے گا

پلٹے گا پلٹ آئے گا دن
ادبار و الم نہیں رہے گا

آنکھوں میں سجیں گے خواب، سب خواب
دامن کوئی نم نہیں رہے گا

عالم میں خرابۂ خوش آثار
قامت ترا کم نہیں رہے گا

یا بات رہے گی اہلِ حق کی
یا پھر یہ قلم نہیں رہے گا

ستاروں سے بھرا یہ آسماں کیسا لگے گا
ہمارے بعد تم کو یہ جہاں کیسا لگے گا

تھکے ہارے ہوئے سورج کی بھیگی روشنی میں
ہواؤں سے اُلجھتا بادباں کیسا لگے گا

جمے قدموں کے نیچے سے پھسلتی جائے گی ریت
بکھر جائے گی جب عمرِ رواں کیسا لگے گا

اِسی مٹی میں مل جائے گی پونجی عُمر بھر کی
گرے گی جس گھڑی دیوارِ جاں، کیسا لگے گا

بہت اِترا رہے ہو دل کی بازی جیتنے پر
زیاں بعد از زیاں بعد از زیاں کیسا لگے گا

وہ جس کے بعد ہوگی اک مسلسل بے نیازی
گھڑی بھر کا وہ سب شور و فغاں کیسا لگے گا

ابھی سے کیا بتائیں مرگِ مجنوں کی خبر پر
سلوکِ کوچۂ نامہرباں کیسا لگے گا

بتاؤ تو سہی اے جانِ جاں کیسا لگے گا
ستاروں سے بھرا یہ آسماں کیسا لگے گا

ہمیں خبر تھی کہ یہ درد اب تھمے گا نہیں
یہ دل کا ساتھ بہت دیر تک رہے گا نہیں

ہمیں خبر تھی کوئی آنکھ نم نہیں ہو گی
ہمارے غم میں کہیں کوئی دل دُکھے گا نہیں

ہمیں خبر تھی کہ اِک روز یہ بھی ہونا ہے
کہ ہم کلام کریں گے کوئی سنے گا نہیں

ہماری دربدری جانتی تھی برسوں سے
گھر آئیں گے بھی تو کوئی پناہ دے گا نہیں

ہماری طرح نہ آئے گا کوئی زد میں
ہماری طرح کوئی قافلہ لٹے گا نہیں

نمودِ خواب کی باتیں شکستِ خواب کا ذکر
ہمارے بعد یہ قصے کوئی کہے گا نہیں

غریبِ شہر ہو یا شہریارِ ہفت اقلیم
یہ وقت ہے، یہ کسی کے لیے رُکے گا نہیں

مگر چراغِ ہنر کا معاملہ ہے کچھ اور
یہ ایک بار جلا ہے تو اب بجھے گا نہیں

بکھر جائیں گے ہم کیا جب تماشا ختم ہو گا
مرے معبود! آخر کب تماشا ختم ہو گا

چراغِ حجرۂ درویش کی بجھتی ہوئی لو
ہوا سے کہہ رہی ہے اب تماشا ختم ہو گا

کہانی میں نئے کردار شامل ہو گئے ہیں
نہیں معلوم اب کس ڈھب تماشا ختم ہو گا

کہانی آپ الجھی ہے کہ الجھائی گئی ہے
یہ عقدہ تب کھلے گا جب تماشا ختم ہو گا

زمیں جب عدل سے بھر جائے گی نورٌ علیٰ نور
بنامِ مسلک و مذہب تماشا ختم ہو گا

یہ سب کٹھ پتلیاں رقصاں رہیں گی رات کی رات
سحر سے پہلے پہلے سب تماشا ختم ہو گا

تماشا کرنے والوں کو خبر دی جا چکی ہے
کہ پردہ کب گرے گا کب تماشا ختم ہو گا

دلِ نا مطمئن ایسا بھی کیا مایوس رہنا
جو خلق اٹھی تو سب کرتب تماشا ختم ہو گا

یہ بستیاں ہیں کہ مقتل دُعا کیے جائیں
دُعا کے دن ہیں مسلسل دُعا کیے جائیں

کوئی فغاں، کوئی نالہ، کوئی بکا، کوئی بین
کھلے گا بابِ مقفّل دُعا کیے جائیں

یہ اضطراب، یہ لمبا سفر، یہ تنہائی
یہ رات اور یہ جنگل دُعا کیے جائیں

بحال ہو کے رہے گی فضائے خطۂ خیر
یہ حبس ہو گا معطّل دُعا کیے جائیں

گزشتگانِ محبت کے خواب کی سوگند
وہ خواب ہوگا مکمل دعا کیے جائیں

ہوائے سرکش و سفاک کے مقابل بھی
یہ دل بجھیں گے نہ مشعل دعا کیے جائیں

غبار اُڑاتی جھلستی ہوئی زمینوں پر
اُمڈ کے آئیں گے بادل دعا کیے جائیں

قبول ہونا مقدر ہے حرفِ خالص کا
ہر ایک آن ہر اک پل دعا کیے جائیں

یہ نقش ہم جو سرِ لوحِ جاں بناتے ہیں
کوئی بناتا ہے ہم خود کہاں بناتے ہیں

یہ سُر، یہ تال، یہ لے، کچھ نہیں بجز توفیق
تو پھر یہ کیا ہے کہ ہم ارمغاں بناتے ہیں

سمندر اُس کا، ہوا اُس کی، آسماں اُس کا
وہ جس کے اِذن سے ہم کشتیاں بناتے ہیں

زمیں کی دھوپ، زمانے کی دھوپ، ذہن کی دھوپ
ہم ایسی دھوپ میں بھی سائباں بناتے ہیں

خود اپنی خاک سے کرتے ہیں موجِ نور کشید
پھر اس سے ایک نئی کہکشاں بناتے ہیں

کہانی جب نظر آتی ہے ختم ہوتی ہوئی
وہیں سے ایک نئی داستاں بناتے ہیں

کھلی فضا میں خوش آواز طائروں کے ہجوم
مگر وہ لوگ جو تیر و سناں بناتے ہیں

''پلٹ کے آئے غریب الوطن پلٹنا تھا''
یہ دیکھنا ہے کہ اب گھر کہاں بناتے ہیں

دل کو دیوار کریں، صبر سے وحشت کریں ہم
خاک ہو جائیں جو رسوائی کو شہرت کریں ہم

اک قیامت کہ تلی بیٹھی ہے پامالی پر
یہ گزر لے تو بیانِ قد و قامت کریں ہم

حرفِ تردید سے پڑ سکتے ہیں سو طرح کے پیچ
ایسے سادہ بھی نہیں ہیں کہ وضاحت کریں ہم

دل کے ہمراہ گزارے گئے سب عمر کے دن
شام آئی ہے تو کیا ترکِ محبت کریں ہم

اک ہماری بھی امانت ہے تہِ خاک یہاں
کیسے ممکن ہے کہ اس شہر سے ہجرت کریں ہم

دن نکلنے کو ہے چہروں پہ سجا لیں دنیا
صبح سے پہلے ہر اک خواب کو رخصت کریں ہم

شوق آرائشِ محفل بھی سلامت ہے کہ صبا
کہتی پھرتی ہے کہیں اور نہ رخصت کریں ہم

عمر بھر دل میں سجاتے پھرے اوروں کی شبیہ
کبھی ایسا ہو کہ اپنی بھی زیارت کریں ہم

خوابِ دیرینہ سے رخصت کا سبب پوچھتے ہیں
چلیے پہلے نہیں پوچھا تھا تو اب پوچھتے ہیں

کیسے خوش طبع ہیں اس شہرِ دل آزار کے لوگ
موجِ خوں سر سے گزر جاتی ہے تب پوچھتے ہیں

اہلِ دنیا کا تو کیا ذکر کہ دیوانوں کو
صاحبانِ دلِ شوریدہ بھی کب پوچھتے ہیں

خاک اُڑاتی ہوئی راتیں ہوں کہ بھیگے ہوئے دن
اوّلِ صبح کے غم آخرِ شب پوچھتے ہیں

ایک ہم ہی تو نہیں ہیں جو اُٹھاتے ہیں سوال
جتنے ہیں خاک بسر شہر کے سب پوچھتے ہیں

یہی مجبور، یہی مہر بلب، بے آواز
پوچھنے پر کبھی آئیں تو غضب پوچھتے ہیں

کرمِ مسند و منبر کہ اب اربابِ حکم
ظلم کر چکتے ہیں تب مرضیِ رب پوچھتے ہیں

ہم اپنے رفتگاں کو یاد رکھنا چاہتے ہیں
دلوں کو درد سے آباد رکھنا چاہتے ہیں

مبادا مندمل زخموں کی صورت بھول ہی جائیں
ابھی کچھ دن یہ گھر برباد رکھنا چاہتے ہیں

بہت رونق تھی اُن کے دم قدم سے شہرِ جاں میں
وہی رونق ہم اُن کے بعد رکھنا چاہتے ہیں

بہت مشکل زمانوں میں بھی ہم اہلِ محبت
وفا پر عشق کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں

سروں میں ایک ہی سودا کہ لو دینے لگے خاک

امیدیں حسبِ استعداد رکھنا چاہتے ہیں

کہیں ایسا نہ ہو حرفِ دعا مفہوم کھو دے

دعا کو صورتِ فریاد رکھنا چاہتے ہیں

قلم آلودۂ نانِ [illegible] رہتا ہے پھر بھی

جہاں تک ہو سکے آزاد رکھنا چاہتے ہیں

حدودِ جاں سے پرے جا رہا ہے اور طرف
لہو بدن کو لیے جا رہا ہے اور طرف

گھِرے زمیں کی طرف شاخِ سرخرو کی مثال
مثالِ ابر گھِرے جا رہا ہے اور طرف

غبارِ جادۂ بے اعتبار، آخرِ کار
تلاش کر کے مجھے جا رہا ہے اور طرف

مری طرح ہے مرے شہر کا مقدر بھی
بکھر بکھر کے بسے جا رہا ہے اور طرف

میں ایک اور طرف جا رہا ہوں خواب کے ساتھ
زمانہ مجھ کو لیے جا رہا ہے اور طرف

محاذ رات نے کھولے ہوئے ہیں دل کے خلاف
مگر چراغ جلے جا رہا ہے اور طرف

آسمانوں پر نظر کر انجم و مہتاب دیکھ
صبح کی بنیاد رکھنی ہے تو پہلے خواب دیکھ

ہم بھی سوچیں گے دعائے بے اثر کے باب میں
اک نظر تو بھی تضادِ منبر و محراب دیکھ

دوش پر ترکش چڑھا رہنے دے پہلے دل سنبھال
دل سنبھل جائے تو سوئے سینۂ احباب دیکھ

موجۂ سرکش کناروں سے چھلک جائے تو پھر
کیسی کیسی بستیاں آتی ہیں زیرِ آب دیکھ

بوند میں سارا سمندر آنکھ میں کُل کائنات
ایک مشت خاک میں سورج کی آب و تاب دیکھ

کچھ قلندر مشربوں سے راہ و رسم عشق سیکھ
کچھ ہم آشفتہ مزاجوں کے ادب آداب دیکھ

شب کو خطِ نور میں لکھی ہوئی تعبیر پڑھ
صبح تک دیوارِ دریا میں کھلتے باب دیکھ

افتخار عارف کے تند و تیز لہجے پر نہ جا
افتخار عارف کی آنکھوں میں الجھتے خواب دیکھ

ہم نہ ہوئے تو کوئی افق مہتاب نہیں دیکھے گا
ایسی نیند اُڑے گی پھر کوئی خواب نہیں دیکھے گا

نرمی اور مٹھاس میں ڈوبا یہی مہذب لہجہ
تلخ ہوا تو محفل کے آداب نہیں دیکھے گا

پیش لفظ سے اختتام تک پڑھنے والا قاری
جس میں ہم تحریر ہیں بس وہی باب نہیں دیکھے گا

لہو رُلاتے، خاک اُڑاتے موسم کی سفاکی
دیکھتے ہیں کب تک یہ شہرِ گلاب نہیں دیکھے گا

بپھرے ہوئے دریا کو ہوا کا ایک اشارہ کافی
کوئی گھر، کوئی بھی گھر سیلاب نہیں دیکھے گا

بے معنی بے مصرف عمر کی آخری شام کا آنسو
ایک سبب دیکھے گا سب اسباب نہیں دیکھے گا

اک ہجرت اور ایک مسلسل دربدری کا قصہ
سب تعبیریں دیکھیں گے کوئی خواب نہیں دیکھے گا
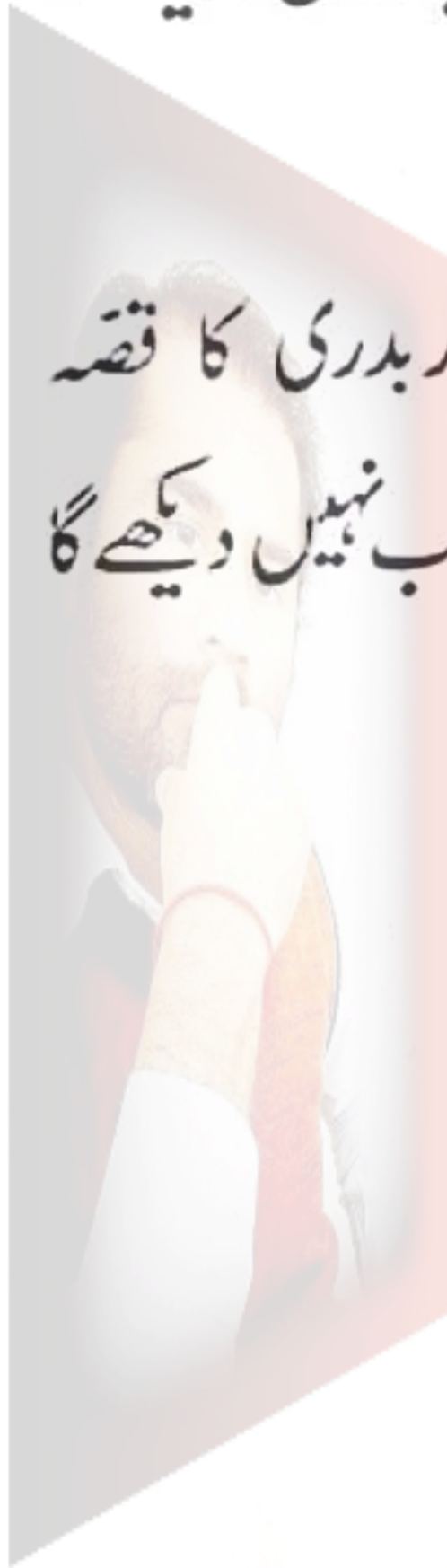
مقدر ہو چکا ہے بے در و دیوار رہنا
کہیں طے پا رہا ہے شہر کا مسمار رہنا

نمودِ خواب کے اور انہدامِ خواب کے بیچ
قیامت مرحلہ ہے دل کا ناہموار رہنا

دلوں کے درمیاں دُوری کے دن ہیں اور ہم کو
اسی موسم میں تنہا برسرِ پیکار رہنا

اندھیری رات اور شورِ سگانِ کوئے دُشنام
اور ایسے میں کسی اک آنکھ کا بیدار رہنا

تماشا کرنے والے آ رہے ہیں جوق در جوق
گروہِ پابجولاں! رقص کو تیار رہنا

ہوائے کوئے قاتل بے ادب ہونے لگی ہے
چراغِ جادۂ صدق و صفا ہشیار رہنا

یہ دشواری تو آسانی کا خمیازہ ہے ورنہ
بہت ہی سہل تھا ہم کو بہت دشوار رہنا

ادھر کچھ دن سے اس بستی کو راس آنے لگا ہے
ہم آشفتہ سروں کے در پئے آزار رہنا

کوئی مژدہ نہ بشارت نہ دُعا چاہتی ہے
روز اک تازہ خبر خلقِ خدا چاہتی ہے

موجِ خوں سر سے گزرنی تھی سو وہ بھی گزری
اور کیا کوچۂ قاتل کی ہوا چاہتی ہے

شہرِ بے مہر میں لب بستہ غلاموں کی قطار
نئے آئینِ اسیری کی بِنا چاہتی ہے

کوئی بولے کہ نہ بولے قدم اُٹھیں نہ اُٹھیں
وہ جو اک دل میں ہے دیوار اُٹھا چاہتی ہے

ہم بھی لبیک کہیں اور فسانہ بن جائیں
کوئی آواز سرِ کوہِ ندا چاہتی ہے

یہی لَو تھی کہ اُلجھتی رہی ہر رات کے ساتھ
اب کے خود اپنی ہواؤں میں بجھا چاہتی ہے

عہدِ آسودگیِ جاں میں بھی تھا جاں سے عزیز
وہ قلم بھی مرے دشمن کی انا چاہتی ہے

بہرِ پامالیِ گل آئی ہے اور موجِ خزاں
گفتگو میں روشِ بادِ صبا چاہتی ہے

خاک کو ہمسرِ مہتاب کیا رات کی رات
خلق اب بھی وہی نقشِ کفِ پا چاہتی ہے

فضا میں وحشتِ سنگ و سناں کے ہوتے ہوئے
قلم ہے رقص میں آشوبِ جاں کے ہوتے ہوئے

ہمیں میں رہتے ہیں وہ لوگ بھی کہ جن کے سبب
زمیں بلند ہوئی آسماں کے ہوتے ہوئے

بضد ہے دل کہ نئے راستے نکالے جائیں
نشانِ رہگزرِ رفتگاں کے ہوتے ہوئے

جہانِ خیر میں اک حجرۂ قناعت و صبر
خدا کرے کہ رہے جسم و جاں کے ہوتے ہوئے

قدم قدم پہ دلِ خوش گماں نے کھائی مات
روش روش نگہِ مہرباں کے ہوتے ہوئے

میں ایک سلسلۂ آتشیں میں بیعت تھا
سو خاک ہوگیا نام و نشاں کے ہوتے ہوئے

میں چپ رہا کہ وضاحت سے بات بڑھ جاتی
ہزار شیوۂ حسنِ بیاں کے ہوتے ہوئے

الجھ رہی تھی ہواؤں سے ایک کشتیِ حرف
پڑی ہے ریت پہ آبِ رواں کے ہوتے ہوئے

بس ایک خواب کی صورت کہیں ہے گھر میرا
مکاں کے ہوتے ہوئے لامکاں کے ہوتے ہوئے

دُعا کو ہاتھ اُٹھاتے ہوئے لرزتا ہوں
کبھی دُعا نہیں مانگی تھی ماں کے ہوتے ہوئے

ستارہ وار جلے پھر بجھا دیے گئے ہم
پھر اس کے بعد نظر سے گرا دیے گئے ہم

عزیز تھے ہمیں نوواردانِ کوچۂ عشق
سو پیچھے ہٹتے گئے راستہ دیے گئے ہم

شکست و فتح کے سب فیصلے ہوئے کہیں اور
مثالِ مالِ غنیمت لٹا دیے گئے ہم

زمین فرشِ گل و لالہ سے سجائی گئی
پھر اس زمیں کی امانت بنا دیے گئے ہم

دعائیں یاد کرا دی گئی تھیں بچپن میں
سو زخم کھاتے رہے اور دعا دیے گئے ہم

تارِ شبنم کی طرح، صورتِ خس ٹوٹتی ہے
آس بندھنے نہیں پاتی ہے کہ بس ٹوٹتی ہے

آرزوؤں کا ہجوم اور یہ ڈھلتی ہوئی عمر
سانس اُکھڑتی ہے نہ زنجیرِ ہوس ٹوٹتی ہے

گرد اتنی کہ سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی
شور اتنا ہے کہ آوازِ جرس ٹوٹتی ہے

منہدم ہوتا چلا جاتا ہے دل سال بہ سال
ایسا لگتا ہے گرہ اب کے برس ٹوٹتی ہے

بوئے گل آئے نہ آئے مگر عشاق کے بیچ
اتنی وحشت ہے کہ دیوارِ قفس ٹوٹتی ہے

ذکرِ اسمائے الٰہی کا ہے فیضان کہ اب
دم الجھتا ہے نہ تسبیحِ نفس ٹوٹتی ہے

اب اس میں کاوش کوئی نہ کچھ اہتمام میرا
ہوائیں محفوظ کر رہی ہیں کلام میرا

میں کچھ کریموں کے بابِ نعمت سے منسلک ہوں
سو خود بخود ہو رہا ہے سب انتظام میرا

تو کیا یہی اک گمان ہے ہر سخن کی بنیاد
کہ حدِ تارِ نفس سے آگے ہے نام میرا

میں سرکشی سے سپردگی کی طرف چلا ہوں
خدا جو چاہے تو یہ بھی بن جائے کام میرا

چلا تو ہوں ایک منزلِ خوش خبر کی جانب
عجب نہیں یہ سفر بھی ہو ناتمام میرا

دلوں کو تاراج کرنے آیا تھا تمکنت سے
پلٹ گیا مجھ کو دیکھ کر خوش خرام میرا

جو لالہ و گل کو خار و خس سے جدا نہ کر پائے
ہر ایسے موسم کو دُور ہی سے سلام میرا

یہ قتل نامے پہ دستخط تو مرے نہیں ہیں
مگر یہ خلقِ خدا جو لیتی ہے نام میرا

یہ میرے دشمن یونہی تو پسپا نہیں ہوئے ہیں
کوئی تو ہے لے رہا ہے جو انتقام میرا

یوں تو نہیں کہ دل میں اب کوئی نئی دُعا نہیں
حرفِ دُعا تو ہے مگر ذکر کا حوصلہ نہیں

دیر بہت ہی دیر تک یاد کیا گیا اُنھیں
ویسے پلٹ کے دیکھنا میرا مزاج تھا نہیں

رات بس اک چراغ کی لَو سے رہا مکالمہ
صبح نہ جانے کب ہوئی، کیسے ہوئی پتا نہیں

ایک ذرا سی بات ہے جس سے پڑے ہیں سارے پیچ
پیچ بھی وہ کہ درمیاں کوئی بھی دوسرا نہیں

کیسی عجیب بات ہے زعمِ ہنر کے باوجود
رنگ بکھر گئے تمام نقش کوئی بنا نہیں

جس میں تمام دل کی بات کھل کے بیان کر سکوں
ایک سخن — وہی سخن مجھ سے کبھی ہوا نہیں

چہرہ بہ چہرہ، لب بہ لب، خواب بہ خواب، دل بہ دل
عمر گزار دی گئی، کوئی کہیں ملا نہیں

میری بیاضِ عشق میں مطلعِ اوّلِ غزل
درج تو کر لیا گیا ویسے کہیں پڑھا نہیں

دل کے معاملوں کے بیچ عمر کہاں سے آ گئی
جانِ جہانِ افتخار! وقت ابھی گیا نہیں

خوف کے سیلِ مسلسل سے نکالے مجھے کوئی
میں پیمبر تو نہیں ہوں کہ بچا لے مجھے کوئی

اپنی دنیا کے مہ و مہر سمیٹے، سرِ شام
کر گیا جادۂ فردا کے حوالے مجھے کوئی

اتنی دیر اور توقف کہ یہ آنکھیں بجھ جائیں
کسی بے نور خرابے میں اُجالے مجھے کوئی

کس کو فرصت ہے کہ تعمیر کرے از سرِ نو
خانۂ خواب کے ملبے سے نکالے مجھے کوئی

اب کہیں جا کے سمیٹی ہے امیدوں کی بساط
ورنہ اک عُمر کی ضد تھی کہ سنبھالے مجھے کوئی

کیا عجب خیمۂ جاں تیری طنابیں کٹ جائیں
اِس سے پہلے کہ ہواؤں میں اچھالے مجھے کوئی

کیسی خواہش تھی کہ سوچو تو ہنسی آتی ہے
جیسے میں چاہوں اسی طرح بنالے مجھے کوئی

تیری مرضی، مری تقدیر کہ تنہا رہ جاؤں
مگر اک آس تو دے پالنے والے مجھے کوئی

دلوں کو جوڑتی ہے، سلسلہ بناتی ہے
ہر امتحاں میں دُعا راستہ بناتی ہے

یہ سیلِ سرکش و سفاک کا ہدف، مرے گھر
کوئی دن اور کہ خلقِ خدا بناتی ہے

یہ زندگی جو ابھی دھوپ ہے، ابھی سایہ
ہر آن ایک نیا دائرہ بناتی ہے

ہزار بار یہ دیکھا گیا کہ ہجر کی رات
بجھے چراغ کی لَو خود ہوا بناتی ہے

صدا، سکوت کی منزل میں بھی بشرطِ خلوص
زمانہ کیسا بھی ہو، ہم نوا بناتی ہے

شبِ شعر میں ہنر آشکارا مرا بھی ہو
افقِ کمال پہ اک ستارا مرا بھی ہو

یہ جو اک جزیرۂ خوش خبر پہ رُکا ہے چاند
کچھ عجب نہیں کہ وہیں کنارا مرا بھی ہو

وہ جو ایک خواب کے فاصلے پہ ہے رہگزر
اُسی رہگزر پہ گزر دوبارہ مرا بھی ہو

مری مستجاب دُعاؤں میں یہ دُعا بھی تھی
وہ جو خواب دیر سے ہے تمھارا مرا بھی ہو

ہو کے دنیا میں بھی دنیا سے رہا اور طرف
دل کسی اور طرف، دستِ دُعا اور طرف

اک رَجَز خواں ہنرِ کاسہ و کشکول میں طاق
جب صف آرا ہوئے لشکر تو ملا اور طرف

اے بہ ہر لحظہ نئے وہم میں اُلجھے ہوئے شخص
میری محفل میں اُلجھتا ہے تو جا اور طرف

اہلِ تشہیر و تماشا کے طلسمات کی خیر
چل پڑے شہر کے سب شعلہ نوا اور طرف

کیا مسافر تھا سفر کرتا تھا اِس بستی میں
اور لَو دیتے تھے نقشِ کفِ پا اور طرف

شاخِ مژگاں سے جو ٹوٹا تھا ستارہ سرِ شام
رات آئی تو وہی پھول کھلا اور طرف

نرغۂ ظلم میں دُکھ سہتی رہی خلقتِ شہر
اہلِ دُنیا نے کیے جشن بپا اور طرف
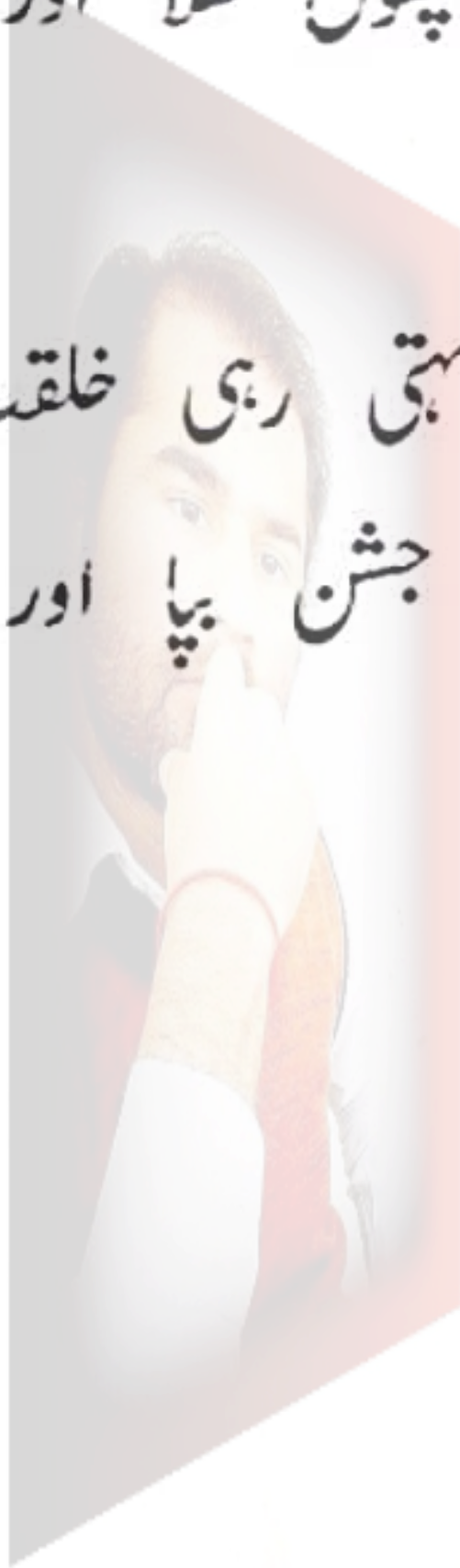
دوست کیا خود کو بھی پرسش کی اجازت نہیں دی
دل کو خوں ہونے دیا، آنکھ کو زحمت نہیں دی

ہم بھی اُس سلسلۂ عشق میں بیعت ہیں جسے
ہجر نے دُکھ نہ دیا، وصل نے راحت نہیں دی

ہم بھی اک شام بہت الجھے ہوئے تھے خود میں
ایک شام اُس کو بھی حالات نے مہلت نہیں دی

عاجزی بخشی گئی تمکنتِ فقر کے ساتھ
دینے والے نے ہمیں کون سی دولت نہیں دی

بے وفا دوست کبھی لوٹ کے آئے تو انھیں
ہم نے اظہارِ ندامت کی اذیت نہیں دی

دل کبھی خواب کے پیچھے، کبھی دُنیا کی طرف
ایک نے اجر دیا، ایک نے اُجرت نہیں دی

کوئی سبب ہے جو تاریک شب ہوئی ہے میاں
کسی کی شہ پہ ہوا بے ادب ہوئی ہے میاں

اس اہتمام سے اہلِ نظر کی رُسوائی
ہوئی نہ تھی کبھی پہلے جو اب ہوئی ہے میاں

عجب نہیں در و دیوارِ شہر پر بھی ہو نقش
یہ گفتگو جو ابھی زیرِ لب ہوئی ہے میاں

بساطِ خواب اُلٹنے کی بات، آخری بات
ہم اُٹھ کے آئے ہیں محفل سے تب ہوئی ہے میاں

نشان و خلعت و منصب کا ذکر کیا کہ یہاں
بہ کارِ عشق بھی عرضی طلب ہوئی ہے میاں

ہم اپنے دل ہی کی آزردگی نہ کم کر پائے
یہ خلق ہم سے خفا بے سبب ہوئی ہے میاں
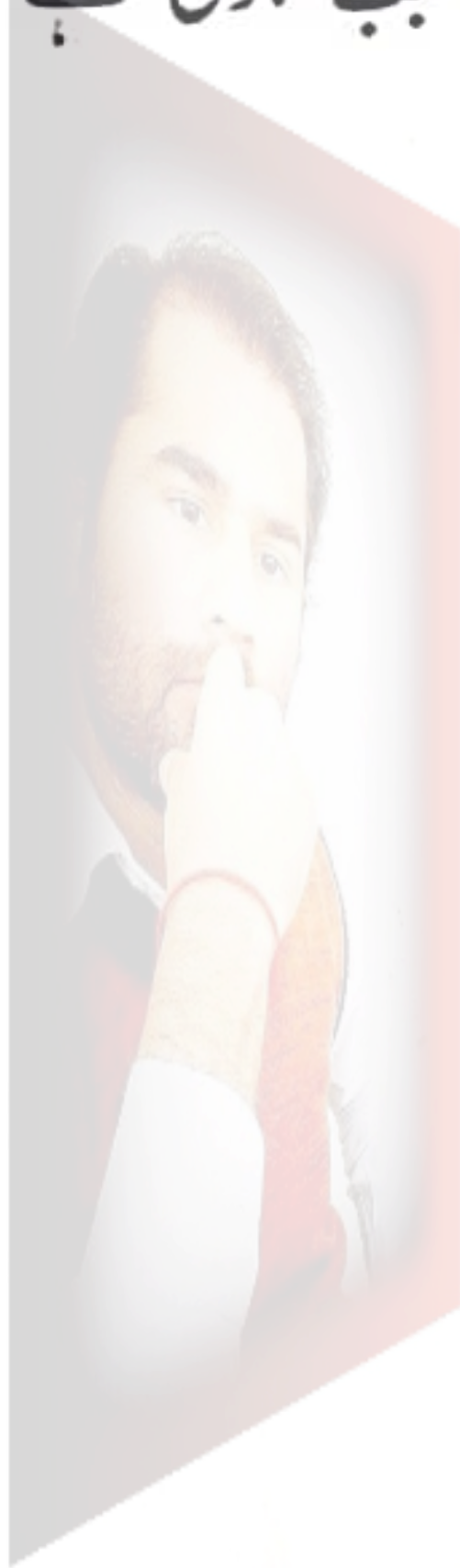
معیارِ شرف حلقۂ اربابِ ہنر میں
ٹھہرا ہے تو بس حرف ہی ٹھہرا ہے نظر میں

مٹی ہیں سو مٹی ہی سے رکھتے ہیں سروکار
آتے نہیں خورشید مزاجوں کے اثر میں

گرنے بھی نہیں پاتے دُعاؤں کو اُٹھے ہاتھ
کشتی کو کنارے نظر آتے ہیں بھنور میں

ہم بھی ہیں عجب لوگ سمجھتے تو ہیں پھر بھی
بازار کے آشوب اُٹھا لاتے ہیں گھر میں

رسم و رہِ آسودگیِ جاں کی ہُوا نذر
وہ جاں سے گزر جانے کا سودا کہ تھا سر میں

اے راہ روو! کچھ تو خبر دو کہ ہُوا کیا
خوابوں کا خزانہ بھی تو تھا زادِ سفر میں
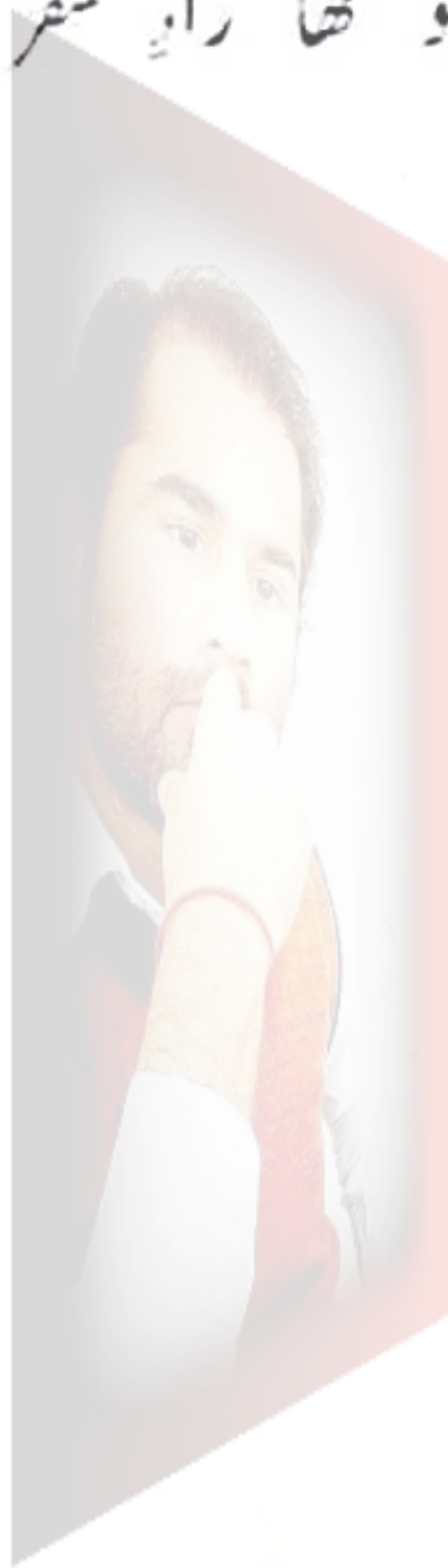
یہ کیا کہ خاک ہوئے ہم جہاں وہیں کے نہیں
جو ہم یہاں کے نہیں ہیں تو پھر کہیں کے نہیں

وفا سرشت میں ہوتی تو سامنے آتی
وہ کیا فلک سے نبھائیں گے جو زمیں کے نہیں

ہوا کی گرم خرامی سے پڑ رہے ہیں بھنور
یہ پیچ و تاب کسی موجِ تہ نشیں کے نہیں

سنا گیا ہے کہ اکثر قیام و ذکر و سجود
ہیں جس کے نام اُسی جان آفریں کے نہیں

تمام عمر پھرے در بدر کہ گھر ہو جائے
گھروں میں رہنا بھی تقدیر میں انھیں کے نہیں

بکھر رہے ہیں جو آنسو بغیر منتِ دوست
وہ دامنوں کی امانت ہیں آستیں کے نہیں
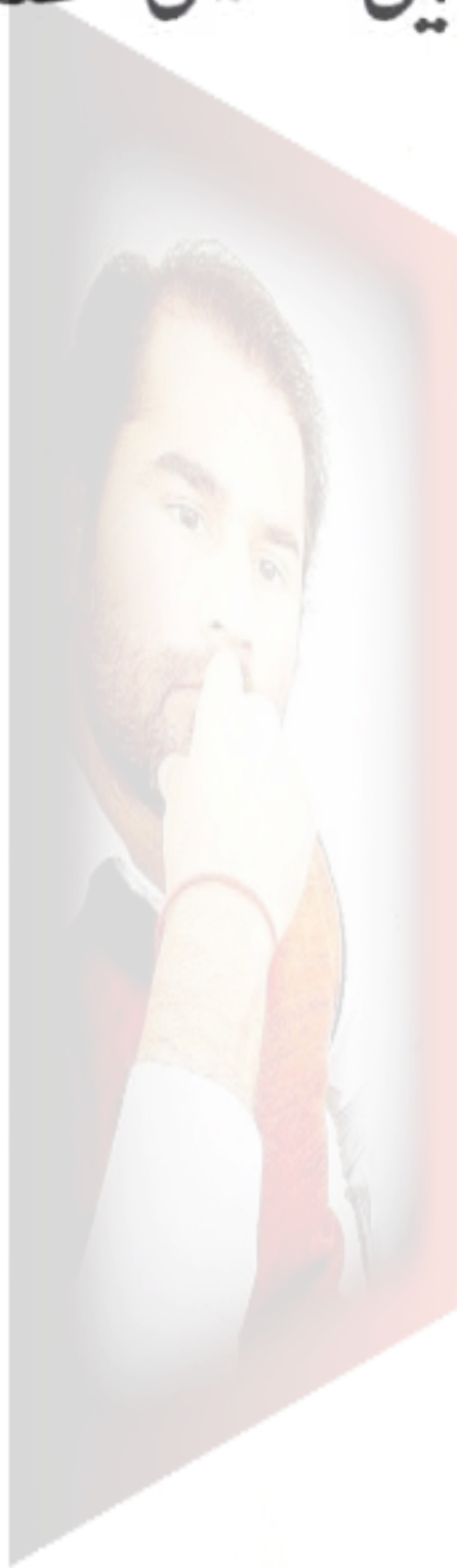
کچھ بھی نہیں کہیں نہیں خواب کے اختیار میں
رات گزار دی گئی صبح کے انتظار میں

بابِ عطا کے سامنے اہلِ کمال کا ہجوم
جن کو تھا سرکشی پہ ناز وہ بھی اُسی قطار میں

جیسے فسادِ خون سے جلدِ بدن پہ داغِ برص
دِل کی سیاہیاں بھی ہیں دامنِ داغ دار میں

وقت کی ٹھوکروں میں ہے عقدہ کشائیوں کا زعم
کیسی اُلجھ رہی ہے ڈور ناخنِ ہوشیار میں

آئے گا آئے گا وہ دن ہو کے رہے گا سب حساب
وقت بھی انتظار میں خلق بھی انتظار میں

جیسی لگی تھی دل میں آگ، ویسی غزل بنی نہیں
لفظ ٹھہر نہیں سکے درد کی تیز دھار میں

ملے گی داد فغاں کیا ہمیں نہیں معلوم
کہیں گے اہل جہاں کیا ہمیں نہیں معلوم

ہمیں تو بس یونہی جلنا ہے، خاک ہونا ہے
چراغ کیا ہے دھواں کیا، ہمیں نہیں معلوم

ہمیں تو ایک ہی موسم ہے راس موسم درد
بہار کیا ہے خزاں کیا، ہمیں نہیں معلوم

بجا کہ حاصل حسن کلام کچھ بھی نہیں
کریں گے سنگ و سناں کیا ہمیں نہیں معلوم

پسِ غبار ہے کیا کچھ خبر نہیں ہم کو
عیاں ہے کون، نہاں کیا، ہمیں نہیں معلوم

وہ جن کی تیغ بھی دامن بھی آستیں بھی ہے سرخ
وہیں ملے گی اماں کیا ہمیں نہیں معلوم

یہ عہدِ سنگ سرشتاں ہے اس زمانے میں
جوازِ شیشہ گراں کیا ہمیں نہیں معلوم
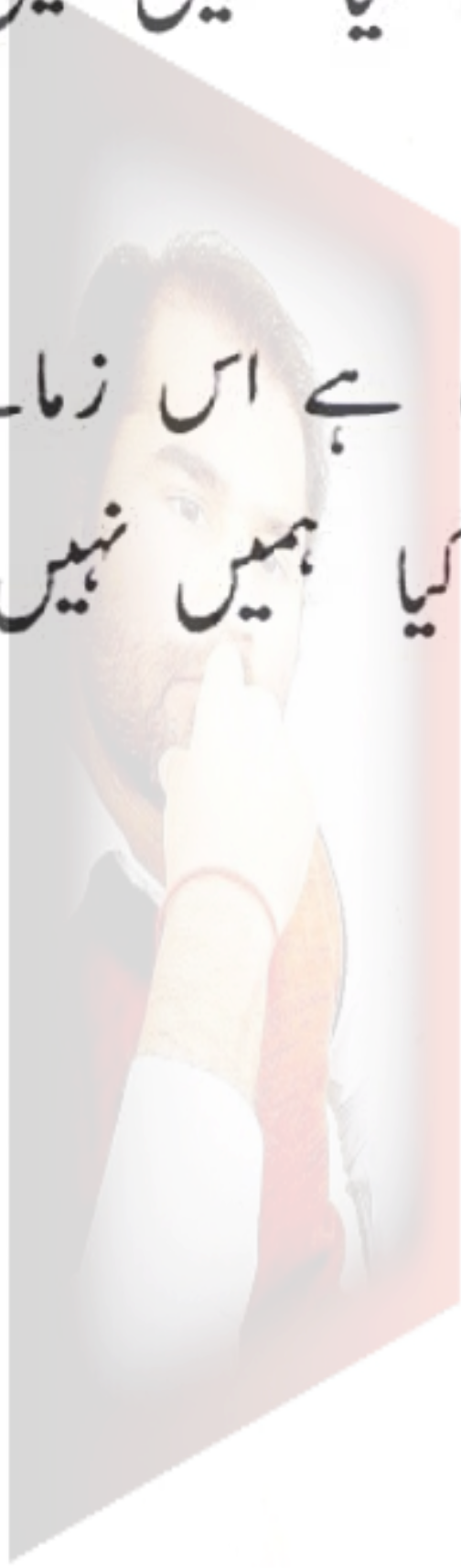
زمانہ خوش کہاں ہے سب سے بے نیاز کر کے بھی
چراغِ جاں کو نذرِ بادِ بے لحاظ کر کے بھی

غلام گردشوں میں ساری عمر کاٹ دی گئی
حصولِ جاہ کی روش پہ اعتراض کر کے بھی

خجل ہوئی ہیں قامتیں قیامتوں کے زعم میں
مذاق بن کے رہ گئی ہیں قد دراز کر کے بھی

بس اتنا ہو کہ شغلِ ناؤنوش مستقل رہے
قلم کو سرنگوں کیا ہے سرفراز کر کے بھی

کچھ اس طرح کے بھی چراغ شہرِ مصلحت میں تھے
بجھے پڑے ہیں خود ہوا سے ساز باز کر کے بھی

بس اک قدم کبھی پڑا تھا بے محل سو آج تک
میں در بدر ہوں اہتمامِ رخت و ساز کر کے بھی

محاذِ خیبر پر جب فتح کا منظر کھلا تھا
نیا پرچم بعنوانِ مہ و اختر کھلا تھا

صف آرائی ہوئی تھی جب میانِ ظلمت و نور
بڑے تیور سے تیغِ تیز کا جوہر کھلا تھا

ہوا کس کس طرح برہم ہوئی تھی بادباں پر
بھنور کس کس طرح بپھرے تھے جب لنگر کھلا تھا

قیامت مرحلے طے کر کے پہنچے تھے یہاں تک
بہت قلعے گرے تھے تب کہیں اک در کھلا تھا

وہ جس کے حرف میں گم گشتہ صدیاں گونجتی تھیں
اُسی کی فکر سے اسرار کا دفتر کھلا تھا

بہت واضح بہت روشن تھے خدوخالِ فردا
کسی کی آنکھ پر جب خوابِ جاں پرور کھلا تھا

وہی منزل اُفق آفاق تک پھیلی ہوئی تھی
وہ جس کا ایک رستہ خواب کے اندر کھلا تھا
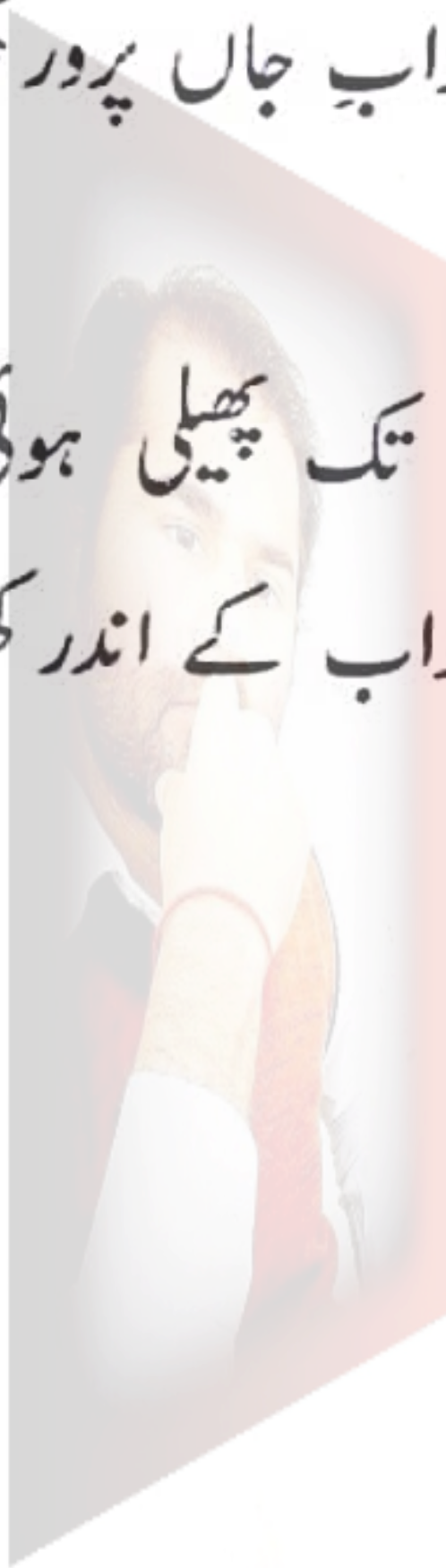
یہ جو گرتی ہوئی دیوار سنبھالے ہوئے ہیں
خلق کہتی ہے اُسی گھر کے نکالے ہوئے ہیں

شہرِ جاں بخش ہمیں تُو تو حقارت سے نہ دیکھ
جیسے بھی ہیں تری آغوش کے پالے ہوئے ہیں

کوچہ گردی کی ہوس ہے نہ تمنا نہ دماغ
پھر یہ کیا ہے کہ جو اب پاؤں میں چھالے ہوئے ہیں

بارشیں جن کی امانت ہیں وہ بادل ہوں کہ ریت
سب کسی ایک سمندر کے اُچھالے ہوئے ہیں

پسپا ہوتے ہوئے لشکر کے سپاہی، مرے لفظ
بجھتے بجھتے بھی زمانے کو اُجالے ہوئے ہیں

پہلے فرصت ہی کہاں تھی کہ تماشا کرتے
دل نے ضد کی ہے تو اب دیکھنے والے ہوئے ہیں

جن سے ہم دشت نوردوں کا بھرم قائم تھا
اب وہ چشمے بھی سمندر کے حوالے ہوئے ہیں

میرؔ و غالبؔ کی طرح شہر میں رُسوا ہوں گے
دونوں ہاتھوں سے جو دستار سنبھالے ہوئے ہیں

(جلیل عالی اور عرفان صدیقی کی زمین میں)

کیا خزانہ تھا کہ چھوڑ آئے ہیں اغیار کے پاس
ایک بستی میں کسی شہرِ خوش آثار کے پاس

دن نکلتا ہے تو لگتا ہے کہ جیسے سورج
صبحِ روشن کی امانت ہو شبِ تار کے پاس

دیکھیے کھلتے ہیں کب انفس و آفاق کے بھید
ہم بھی جاتے تو ہیں اک صاحبِ اسرار کے پاس

خلقتِ شہر کو مژدہ ہو کہ اس عہد میں بھی
خواب محفوظ ہیں اک دیدۂ بیدار کے پاس

ہم وہ مجرم ہیں کہ آسودگیِ جاں کے عوض
رہن رکھ دیتے ہیں دل درہم و دینار کے پاس

کسی گم گشتہ مسافر کی دُعاؤں کا اثر
منزلیں گرد ہوئیں جادۂ ہموار کے پاس

دل کی قیمت پہ بھی اک عہد نبھائے گئے ہم
عمر بھر بیٹھے رہے ایک ہی دیوار کے پاس

شہِ خوبانِ جہاں ایسی بھی عجلت کیا ہے
''خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس''

امانتِ نور جن کے سینوں میں ہے وہ حرفِ یقیں لکھیں گے
ہماری تقدیر اور کوئی نہیں لکھے گا ہمیں لکھیں گے

لہو کے سب رنگ خواب بن کر ہماری آنکھوں میں جاگتے ہیں
سو جب بھی لکھیں گے اپنے خوابوں سے مختلف تو نہیں لکھیں گے

سخن کے سب دل نواز لہجے کشید کر لیں گے کشتِ جاں سے
پھر اُن کو ترتیبِ تازہ دے کر قصیدۂ گل زمیں لکھیں گے

سلامتی ہی سلامتی کی دُعائیں خلقِ خدا کی خاطر
ہماری مٹی پہ حرف آیا تو عہدِ فتحِ مبیں لکھیں گے

خلیلِ آتش نشیں کی میراث کا تسلسل نگاہ میں ہے
سو امتحاں سے گزرنے والوں پہ حرفِ صد آفریں لکھیں گے

جبینوں کو بصد تسلیم خم دیکھا گیا ہے
بہت نا مطمئن آنکھوں میں نم دیکھا گیا ہے

کہیں جائے نمازِ شکر پر آنسو کی اک بوند
اِسی قطرے میں دجلہ یم بہ یم دیکھا گیا ہے

سب آشفتہ سروں کا ایک ہی نعرہ کہ ہم ہیں
ہم آوازوں کو دل کا ہم قدم دیکھا گیا ہے

بیاضِ خوابِ رفتہ کیا عجب ترتیب پا جائے
کتابِ جاں کا شیرازہ بہم دیکھا گیا ہے

اُدھر اُس چاند تارے سے ذرا مشرق کی جانب
سبک لگتا ہوا پرچم عَلَم دیکھا گیا ہے

رفوئے زخمِ دیرینہ کی اک صورت تو نکلی
جدھر دیکھا نہیں تھا کم سے کم دیکھا گیا ہے

یہیں اک منزلِ دشوار و ناہموار کے بیچ
کہیں اک جادۂ بے پیچ و خم دیکھا گیا ہے
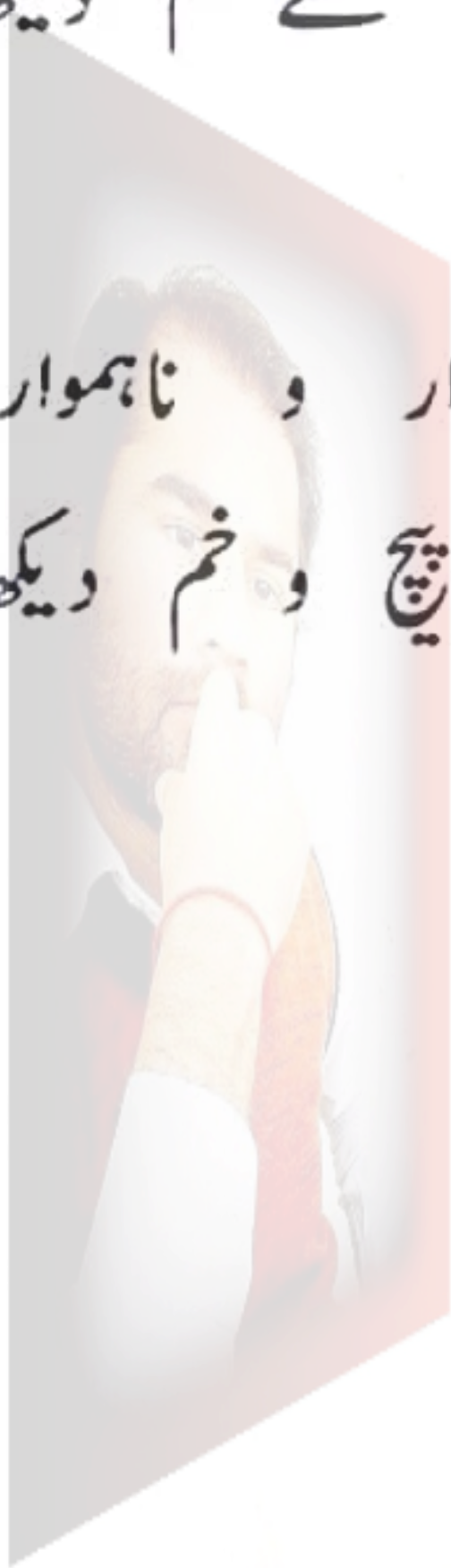
٭

مقامِ شکر کہ عنوانِ گفتگو ہوئے ہم
یہی بہار کے دن تھے کہ سرخرو ہوئے ہم

ابھی کہیں بھی نہیں تھے مگر کسی کی عطا
کسی کا فیض کہ عالم میں چار سو ہوئے ہم

نویدِ نصرت و فتحِ مبیں جلو میں رہی
کچھ اِس یقین سے دشمن کے رُوبرو ہوئے ہم

اندھیری رات اُڑاتی رہی غبارِ سیاہ
دعائے نور کے سائے میں شعلہ رُو ہوئے ہم

مثالِ سبزۂ نورستہ سر بلند رہے
نہ سرنگوں کبھی ٹھہرے نہ بے نمو ہوئے ہم

کوئی تو بات ہم آشفتگاں میں ایسی تھی
کہ خاک ہو کے بھی معیارِ آبرو ہوئے ہم

بس ایک چشمِ خوش اقبال کی توجہ سے
نظر میں آئے نکھارِ رنگ و بو ہوئے ہم
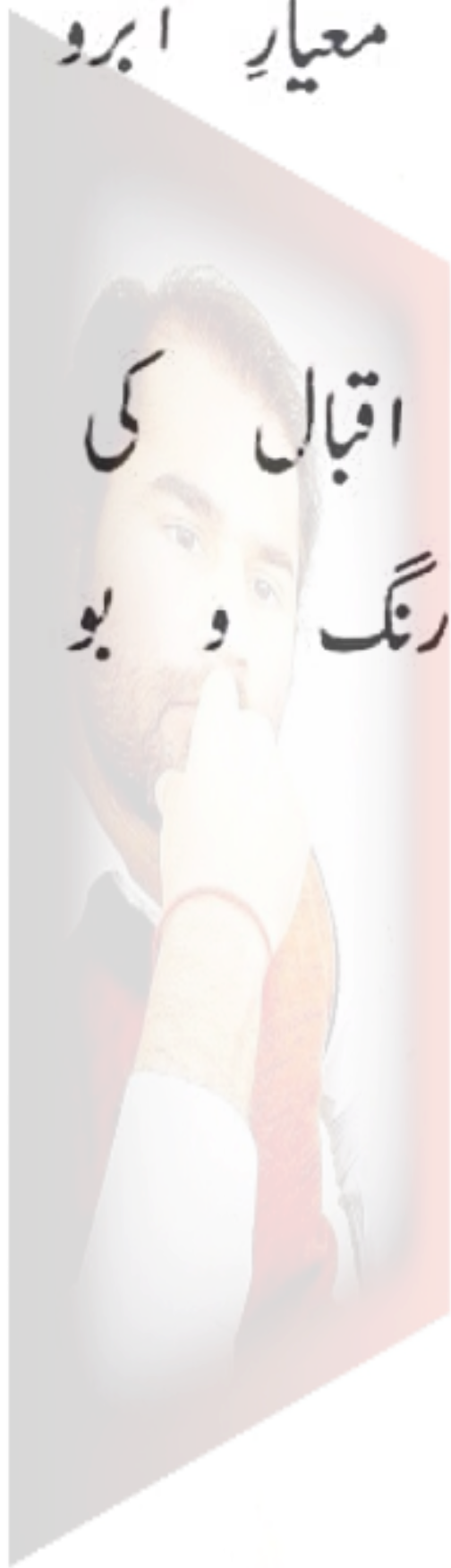
حجرۂ جاں میں باغ کی جانب ایک نیا دربار کیا
ہم نے منبر سے رُوتابی کی بدعت کا آغاز کیا

خوابوں کی پسپائی کے پیچھے گلی گلی تھے جب ہم نے
دل کے ہاتھ پہ بیعت کر لی دنیا کو ناراض کیا

جانے وہ کیسا موسم تھا جس نے بھری بہار کے بعد
اُس گل کو شادابی بخشی ہم کو دست دراز کیا

زندہ لفظ کے مدِ مقابل کیا اورنگ و طبل و علَم
سارے سحر بکھر جائیں گے جب ہم نے اعجاز کیا

درد کی لے کا مدھم رکھنا عینِ ہنر تھا اور ہم نے
باغِ نوا کے خلوتیوں کو خلق کا ہم آواز کیا

✡

شورشِ خلق کو ہنگامۂ عامی نہ سمجھ
چپ کو منجملۂ آدابِ سلامی نہ سمجھ

نعرہ زن ہے جو یہ صف بستہ غلاموں کی قطار
اِن کو اپنے ستم و جور کا حامی نہ سمجھ

آئنہ خانۂ تشہیر کی سج دھج پہ نہ جا
سب تماشا ہے تماشے کو دوامی نہ سمجھ

حرفِ شیرین و دل آویز کو بے صرفہ نہ جان
سخنِ نرم کو تہذیب کی خامی نہ سمجھ

منقلب ہوتا ہے دل انفس و آفاق سمیت
بندگی کو یکے از صنفِ غلامی نہ سمجھ

تیر و شمشیر کی شہ پا کے اچھلتے ہوئے لوگ
یہ ہیں رُسوائے زمانہ انھیں نامی نہ سمجھ

غیروں سے دادِ جور و جفا لی گئی تو کیا
گھر کو جلا کے خاک اُڑا دی گئی تو کیا

غارت گریٔ شہر میں شامل ہے کون کون
یہ بات اہلِ شہر پہ کھل بھی گئی تو کیا

اِک خواب ہی تو تھا جو فراموش ہو گیا
اِک یاد ہی تو تھی جو بھلا دی گئی تو کیا

میثاقِ اعتبار میں تھی اِک وفا کی شرط
اِک شرط ہی تو تھی جو اُٹھا دی گئی تو کیا

قانونِ باغبانیِ صحرا کی سرنوشت
لکھی گئی تو کیا جو نہ لکھی گئی تو کیا

اس قحط و انہدامِ روایت کے عہد میں
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کی گئی تو کیا

جب میرؔ و میرزاؔ کے سخن رائگاں گئے
اِک بے ہنر کی بات نہ سمجھی گئی تو کیا
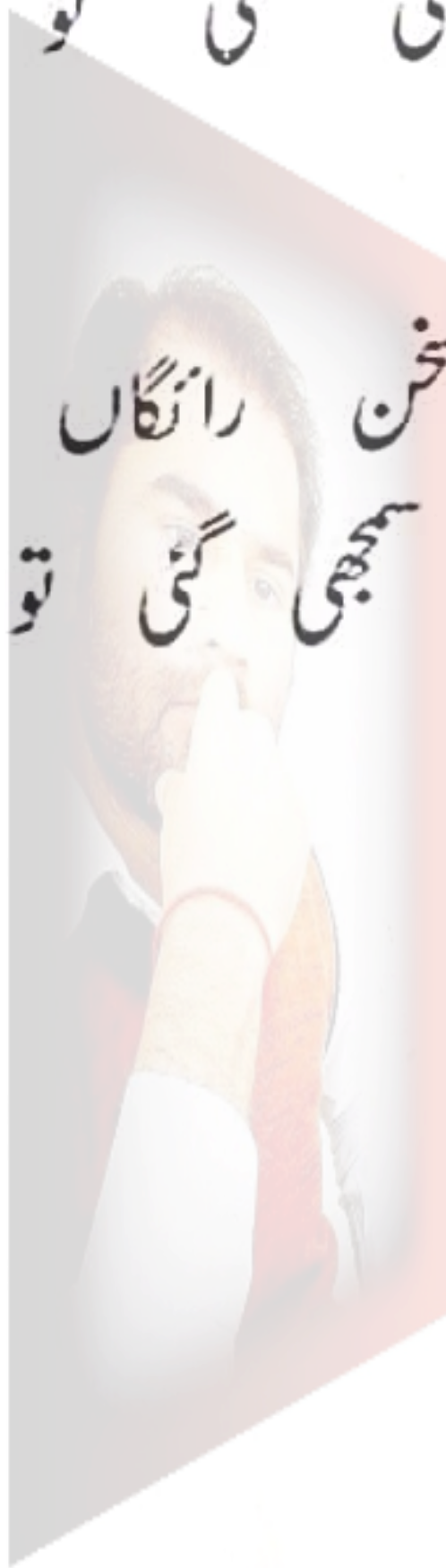
الحمد لائبریری
باب نظم
فیس بک گروپ
کتابیں
پڑھیے
سید حسین احسن
Imagitor

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

نئی تنہائیوں کا دردمند شاعر

زندگی کے نہاں خانوں میں اُتر کر دیکھیے تو تنہائیوں کے کئی سلسلے صدیوں کے اُلٹ پھیر میں اپنے سینوں کا راز کھولتے ہوئے ملیں گے۔ کئی کے آغاز و انجام وقت کے دھندلکوں میں کھو گئے اور کئی انسانیت کے لیے نشانِ شرف بن کر تاریخ کے اوراق کو جگمگا گئے۔ جلاوطنیاں صرف زمینوں، زمانوں، آبادیوں اور بستیوں سے نہیں ہوتیں، خود اپنی ذات سے بھی ہوتی ہیں۔ پاؤں صرف چلنے کے لیے ہیں، قدموں سے ہم صرف مکاں ناپتے ہیں، مکاں چلتے ہیں، لیکن ذہن جست لگاتا ہے اور آنِ واحد میں وجود کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ ساری زمینیں اور زمانے اپنی بساط تہ کر لیتے ہیں۔ کائنات سمٹ کر نقطہ بن جاتی ہے یا پھر کراں تا کراں پھیلا ہوا ایک لامختتم بھید۔ فن معلوم اور نامعلوم کے ایسے ہی مقامات پر جنم لیتا ہے جو ذات اور کائنات میں بھی ہیں اور ذات اور کائنات سے باہر بھی۔ فن کا سفر موجود سے لاموجود اور لاموجود سے موجود کا سفر ہے جس میں مانوس چہروں، تجربوں، مقاموں، زمانوں کی تقلیب ہوتی ہے اور اس کا برعکس بھی صحیح ہے یعنی ذہنی جزیروں کی لامانوس تخلیق، مانوس قالب اختیار کرنے میں سرگرمِ سفر رہتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ذہنی اور زمینی تنہائیوں اور جلاوطنیوں کے رشتے مل جاتے ہیں اور ان سے نئی نئی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ شخصیت اور سوانح اپنی جگہ اہم ہیں لیکن بنیادی چیز وہ اظہاری قوت ہے جس کے تحت یہ اور دوسرے تمام عوامل فن میں بروئے کار آتے ہیں اور

شعر و ادب کی تفہیم و تحسین میں اصولاً سارے حوالے اسی سے نکلتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو افتخار عارف کے یہاں کئی کیفیتیں دوسروں سے بالکل الگ ملیں گی۔ اوّل تو ایک مخلص فن کار کا کرب جو انسان سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے، جو زندگی کا متوالا ہے اور درد کے رشتوں کو سمجھنا چاہتا ہے، جو زندگی، سماج، معاشرے میں شریک بھی ہے اور ان سے باہر بھی، کیوں کہ سنگ دل بے تعلقی یا جلاوطنی کے بغیر درد کا عرفان ممکن نہیں۔ دوسرے مکانی یا بے گھری کا دُکھ جو روزِ آفرینش سے اولادِ آدم کی میراث ہے، جس کے تحت اُسے جنتوں سے نکالا گیا اور اُس نے آسمانوں اور زمینوں کا سفر کیا اور جس کی وجہ سے انسان کی روح کو آج تک قرار نصیب نہیں اور وہ تحرک اور تجسس کی راہوں میں سرگرمِ سفر ہے۔ یہ بے مکانی یا بے گھری سب لذتوں کی لذت اور سب دُکھوں کا دُکھ ہے۔ حق بات یہ ہے کہ احساس کے ان دونوں منطقوں میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا، جبر کا رشتہ مشترک ہے۔ دُکھ درد کا وجود جبر ہی سے ہے جہاں جبر ہے کسی نہ کسی درد کا رشتہ ضرور ہوگا اور جہاں درد ہے وہاں کوئی نہ کوئی جبر ضرور کارفرما ہوگا، خارجی یا باطنی۔ خواہ وہ وجود کا ناگزیر جبر ہو یا سیاسی، فکری نظام، مسلک یا طریق کا خارج سے مسلط کیا ہوا جبر۔ جبر زندگی کی نفی ہے، جبر آزادی کی ضد ہے، جبر کی فضا میں جن چیزوں کی پرورش ہوتی ہے وہ سب کی سب زندگی، خوب صورتی اور سچائی سے تناؤ کا رشتہ رکھتی ہیں، مثلاً ظلم و استبداد، قتل و خوں ریزی، کذب و افترا، حرص و ریا کاری، کمینگی اور خباثت وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام قوتیں آزادی کے لیے چیلنج ہیں۔ اور آزادی کے عدم اور وجود کا یہی چیلنج فنونِ لطیفہ کی جان ہے۔ سچا فن اس کی دہشت سے بھی پیدا ہوتا ہے، اس کے عرفان سے بھی اور اس کے خلاف احتجاج سے بھی۔ افتخار عارف کے یہاں احتجاج کا لہجہ نمایاں ہے۔ ہر احتجاج میں بغاوت کا عنصر ہوتا ہے، دبا ہوا یا پرجوش۔ افتخار عارف کا احتجاج متشددانہ، آتش بار یا غضب ناک نہیں، یہ ایک محبت کرنے کا احتجاج ہے۔ درد آمیز، ہمدردانہ اور مخلصانہ، جس میں زندگی کے کرب اور بے زمینی کے احساس دونوں نے مل کر ایک نئی تڑپ اور نئی تاثیر پیدا کردی ہے۔

کسی بھی اُبھرتے ہوئے شاعر کو سب سے بڑا خطرہ اپنے عہد کی مانوس آوازوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے عہد کی آوازوں میں میرا جی، راشد، جوش، یگانہ، فراق اور فیض کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ یگانہ کا اثر محدود ہے اور جوش کا اثر ان کی زندگی ہی میں فنا ہوگیا۔ البتہ دوسروں کے

فیوض و برکات جاری ہیں۔ افتخار عارف اپنے رومانی مزاج اور احتجاجی حوالے سے فیض کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لگتا ہے انھیں اس کا احساس بھی ہے کہ ان کی طرزِ گفتار کو سب سے بڑا خطرہ فیض سے لاحق ہے کیوں کہ فیض کی رومانی اور انقلابی شاعری نے اس نوعیت کے اسلوب کے امکانات کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ اب جو بھی آئے گا یا تو وادیِ تقلید میں گلگشت فرمائے گا یا بہت عزت ملی تو بے مزہ شاعری کے دربارِ عام سے خلعتِ فاخرہ پائے گا۔ حسن و محبت اور انقلاب و انحراف ابدی موضوعات ہیں۔ لیکن شعری اختصاص و امتیاز کی راہیں فکر و اظہار کی تازہ کارانہ پیرایوں ہی سے نکل سکتی ہیں۔ افتخار عارف کو اس کا پورا احساس ہے۔ انھوں نے کلاسیکی روایت سے خوش سلیقگی کی روشنی لی ہے اور اسے غیر رسمی بے تکلف تازہ لہجے سے پیوند کیا ہے۔ اس میں کچھ ہاتھ اُودھی کے تخلیقی ربط کا بھی ہے جو ابتدائی عمر کی دین ہو سکتا ہے۔ ان کی آواز میں نرمی، رس اور لوچ ہے جو اُودھی کی گھلاوٹ اور زمینی پن کی راہ سے آیا ہے۔ کہیں کہیں طویل بحروں میں ارکان کی تعداد بڑھا دی ہے۔ بعض جگہ آوازوں کو بڑھایا گھٹایا ہے جس سے ان کا لہجہ ہندی آہنگ کی داخلی موسیقی سے قریب تر آ گیا ہے۔ انسان سے ان کا لگاؤ اور محرومیوں سے پیدا ہونے والا دردِ محبت احتجاجی لے میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ ایک کیفیت سے کئی کیفیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ افتخار عارف غزلیں اور نظمیں دونوں لکھتے ہیں۔ دونوں پر انھیں یکساں قدرت حاصل ہے لیکن غزل کے اشعار میں شدتِ احساس کہیں زیادہ ہے۔ ایسا شاید ان کے مخصوص تخلیقی مزاج کی وجہ سے ہے یا اُن رموز و علائم کی وجہ سے جنھیں اُن کی شناخت قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں پہلے غزل کے اشعار سے استنباط کیا جاتا ہے:

یہ قرضِ کج کلہی کب تلک ادا ہوگا
تباہ ہو تو گئے ہیں اب اور کیا ہوگا

غبارِ کوچۂ وعدہ بکھرتا جاتا ہے
اب آگے اپنے بکھرنے کا سلسلہ ہوگا

ہوا ہے یوں بھی کہ اک عمر اپنے گھر نہ گئے
یہ جانتے تھے کوئی راہ دیکھتا ہوگا

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے

کاروبارِ جنوں عام تو ہے مگر اِک ذرا مختلف ہے

آج کی رات ننھی سی لَو بھی اگر بچ رہے تو غنیمت

اے چراغِ سرِ کوچۂ باد! اب کے ہوا مختلف ہے

خیمۂ عافیت کے طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقتِ شہر

جاننا چاہتی ہے کہ منزل سے کیوں راستہ مختلف ہے

اب کے میں نے کتابِ مساوات ایک اک ورق پڑھ کے دیکھی

متن میں جانے کیا کچھ لکھا ہے مگر حاشیہ مختلف ہے

عذابِ وحشتِ جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی

نئے سفر کے لیے راستہ نہ مانگے کوئی

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں

عجیب رسم چلی ہے دُعا نہ مانگے کوئی

دُکھ اور طرح کے ہیں دُعا اور طرح کی

اور دامنِ قاتل کی ہوا اور طرح کی

دیوار پہ لکھی ہوئی تحریر ہے کچھ اور

دیتی ہے خبر خلقِ خدا اور طرح کی

بس اور کوئی دِن کہ ذرا وقت ٹھہر جائے

صحراؤں سے آئے گی صدا اور طرح کی

ہم کوئے ملامت سے نکل آئے تو ہم کو

راس آئی نہ پھر آب و ہوا اور طرح کی

یوں دیکھیے تو ''قرضِ کج کلہی''، ''غبارِ کوچۂ وعدہ''، ''چراغِ سرِ کوچۂ باد''، ''کاروبارِ جنوں'' وغیرہ

ترکیبیں اب سے کچھ پہلے کی شاعری کی یاد دلاتی ہیں، لیکن ذرا سے تامل سے معلوم ہوگا کہ یہ سکہ بند تصورات کی فارمولا شاعری نہیں۔ شاعر کی آواز آج کی آواز ہے۔ زندگی آج جن آلام کے نرغے میں ہے اور معاشرہ جن حالات و حوادث کی زد میں ہے، یہ آواز اس کے درد و کرب سے پیدا ہوئی ہے۔ شاعر مثالیت یا عینیت کا سہارا نہیں لے رہا، ورنہ رجائی شاعری کی آسان راہ پر چل سکتا تھا۔ وہ حقیقت کی سنگینی کو پوری سچائی کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ پہلے کا شاعر ہر شخص کو اپنا ہم نوا پاتا تھا، اب صورت یہ ہے کہ:

صدا لگائی تو پرسانِ حال کوئی نہ تھا

قرضِ کج کلہی کا ادا کرنا باعثِ فخر سہی لیکن تباہی کی آخری حد تک پہنچنے کے بعد اب بچا ہی کیا ہے کہ ادائیگی کا سلسلہ جاری رہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو ان غزلوں میں ایک نئی آواز اور نئی معنویت ملتی ہے۔ ان میں جو سماجی سیاسی مفہوم ہے یا جبر کے خلاف جو احتجاج ہے وہ جذباتیت کی دین نہیں بلکہ موجودہ صورتِ حال کی بے مہر آگہی سے پیدا ہوا ہے۔ ذرا ان غزلوں کے قافیے ردیفیں ہی دیکھیے: سلسلہ مختلف ہے، ہوا مختلف ہے، صلہ نہ مانگے کوئی، راستہ نہ مانگے کوئی، وفا اور طرح کی صدا اور طرح کی، لفظوں کا یہ نظام کچھ اور ہی معنیاتی فضا پیدا کر رہا ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ:

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے

مگر خوف یہ ہے کہ چراغِ مراد کی ننھی سی لو بھی زندہ بچتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ پورا معاشرہ ریاکاری کے ایسے رنگ میں رنگ گیا ہے کہ ہر شے کے معنی بدل گئے ہیں۔ لفظ تو سب کے سب رجز کے برتے جاتے ہیں مگر مدعا مختلف ہے۔ کتابِ مساوات کا متن تو سلامت ہے لیکن اس پر جو حاشیہ چڑھایا جا رہا ہے، اس سے متن کا مفہوم بالکل بدل کر رہ گیا ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ زمانہ اتنا بدل گیا ہے کہ اب:

دُکھ اور طرح کے ہیں دُعا اور طرح کی
اور دامنِ قاتل کی ہوا اور طرح کی

یہ انداز ترغیب اور تلقین کی شاعری سے بالکل الگ ہے۔ یہ صورتِ حال کے درد کی شاعری

ہے اور اس درد کا احساس بھی بالواسطہ کرایا گیا ہے یعنی:

عذابِ وحشتِ جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی
نئے سفر کے لیے راستہ نہ مانگے کوئی

ان غزلوں میں اظہار کا جو پیرایہ ہے، جو علائم اور استعارے ہیں، ان کا رشتہ ایسے مفاہیم سے ہے جو تلوار کی دھار کی سی تیزی رکھتے ہیں۔ ان اشعار میں بین المصرعین بہت کچھ ہے اور یہی شاعر کا کمال ہے۔

اب ایک اور پہلو کو لیجیے۔ صاحبانِ ذوق نے ان اشعار کو پڑھتے ہوئے — خیمۂ عافیت کے طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقتِ شہر — تمام شہر مکرم بس ایک مجرم میں یا کوئی تو شہرِ تذبذب کے ساکنوں سے کہے — غور کیا ہوگا کہ ان میں شہر کا پیکر بار بار اُبھرتا ہے، یہ کیسا شہر ہے؟ اس کی خلقت کیسی خلقت ہے؟ یہ کس عذاب میں گرفتار ہے اور کیوں گرفتار ہے؟ یہ شہر مکرم بھی ہے اور مذبذب بھی، کیوں؟ افتخار عارف بار بار جس شہر کا حوالہ لاتے ہیں وہ اردو کی تخلیقی اور ثقافتی روایت کے اجتماعی لاشعور میں بسا ہوا ظلم و استبداد کا کوئی قدیمی نشان تو نہیں؟ یا یہ آج کا کوئی نیا شہر ہے یا نئی بستی؟ یا ایسا معاشرہ جو سیلابِ بلا میں گھر گیا ہے اور بے پناہ عذاب میں گرفتار ہے؟ شاید ان میں سے بعض سوالوں کا جواب ذیل کے اشعار سے مل جائے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شاعر لمحۂ موجود کی دردناک صورتِ حال کو ایک وسیع تر تاریخی اور انسانی تناظر میں دیکھ رہا ہو:

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رَن پڑنا ہے اور گھمسان کا رَن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

بستی بھی سمندر بھی بیاباں بھی مرا ہے
آنکھیں بھی مری خوابِ پریشاں بھی مرا ہے
جو ڈوبتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری

جو لُوٹا جاتا ہے وہ پیماں بھی مرا ہے
جو ہاتھ اُٹھے تھے وہ سبھی ہاتھ تھے میرے
جو چاک ہوا ہے وہ گریباں بھی مرا ہے
جس کی کوئی آواز نہ پہچان نہ منزل
وہ قافلۂ بے سروساماں بھی مرا ہے
ویرانۂ مقتل میں حجاب آیا تو اس بار
خود چیخ پڑا میں کہ عنواں بھی مرا ہے
وارفتگیِ صبحِ بشارت کو خبر کیا
اندیشۂ صد شامِ غریباں بھی مرا ہے

میں جس کو اپنی گواہی میں لے کے آیا ہوں
عجب نہیں کہ وہی آدمی عدو کا بھی ہو
وہ جس کے چاک گریباں پہ تہمتیں ہیں بہت
اُسی کے ہاتھ میں شاید ہنر رفو کا بھی ہو
ثبوتِ محکمیِ جاں تھی جس کی بُرشِ ناز
اُسی کی تیغ سے رشتہ رگِ گلو کا بھی ہو
وفا کے باب میں کارِ سخن تمام ہوا
مری زمین پر اک معرکہ لہو کا بھی ہو

حریمِ لفظ میں کس درجہ بے ادب نکلا
جسے نجیب سمجھتے تھے کم نسب نکلا
ابھی اُٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دستِ کرم
کہ سارا شہر لیے کاسۂ طلب نکلا

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دِنوں سے
نوکِ سناں پر سر نہیں دیکھا بہت دِنوں سے

پتھر پہ سر رکھ کر سونے والے دیکھے
ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دِنوں سے

شاخِ بریدہ کھلی فضا سے پوچھ رہی ہے
کوئی شکستہ پر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

خاک اُڑانے والے لوگوں کی بستی میں
کوئی صورت گر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

سچے سائیں ہمارے حضرت مہر علی شاہ
بابا! ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

واقعۂ کربلا اور اس کے تعلیقات کا انقلابی، سیاسی مفاہیم میں استعمال اردو کی باغیانہ، مجاہدانہ شاعری میں نیا نہیں۔ اس کا سراغ مولانا محمد علی جوہر کی غزلیہ شاعری تک آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ شاگردی اُنھوں نے داغ کی کی تھی لیکن کلاسیکی علامتوں کے پیرائے میں احتجاجی شاعری کا فیضان اُنھیں حسرت موہانی کی ان غزلوں سے پہنچا تھا جو بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں قیدِ فرنگ میں کہی گئی تھیں۔ اس کے بعد یہ علامتیں بار بار اُبھرتی رہی ہیں اور طرح طرح کے مجاہدانہ ابعاد اختیار کرتی رہی ہیں۔ افتخار عارف کے یہاں موجودہ صورتِ حال کی سفاکی کے بیان میں ان سے نئی معنیاتی جہت سامنے آتی ہے۔ پیاس، دشت، گھرانا، رَن پڑنا، ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ، ڈھالیں، شام، مسافر، چاک گریباں، قافلۂ بے سروساماں، صبحِ بشارت، شامِ غریباں، قاتل، خنجر، خیمہ، لشکر، شاخِ بریدہ، شکستہ پر، نوکِ سناں، سیاہ شام، نیزے پہ آفتاب کا سر، کاسۂ طلب، شہ رگ سے مجتنب، یہ سب سامنے کے تعلیقے ہیں۔ یہ درد و کرب بنی نوعِ انسان کا بھی ہو سکتا ہے اور ایک بستی یا پورے سماج کا بھی۔ بات کسی ایک شعر یا مصرعے کی نہیں، افتخار عارف کے یہاں پوری کی پوری غزلیں اس کیفیت سے سرشار نظر آتی ہیں اور ان میں حق طلبی اور دردمندی کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار میں کہیں بھی امرِ واقعہ کا بیان نہیں بلکہ آج کے عذابوں کا

ذکر ہے۔ جن کو صدیوں کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔

وہی پیاس ہے، وہی دشت ہے، وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

دوسری غزل کے اختتامی الفاظ سے — بیاباں بھی مرا ہے، گریباں بھی مرا ہے، درد کے طویل سلسلوں اور ترفع کا اندازہ ہوتا ہے۔ تیسری غزل میں عدو، چاک گریباں، تیغ، رشتۂ گلو، معرکہ، لہو، پوری غزل کو خاص معنیاتی رنگ میں رنگے دے رہے ہیں۔ دوسری غزلوں سے جو اشعار پیش کیے گئے ان میں بھی یہی کیفیت ہے۔ لیکن یہاں ایک اور بات بھی توجہ طلب ہے یعنی شہر، بستی، خلقت اور لشکر کا گہرا تعلق گھر سے ہے۔ ذرا یہ آخری مصرع دیکھیے:

بابا! ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

یہاں گھر سے مراد کیا ہے؟ گھر، گھر بھی ہے محدود معنی میں، اور پوری دنیا بھی — جس میں ہم رہتے ہیں، یہ عذابوں میں گھری ہوئی بستی بھی ہو سکتا ہے اور شہرِ مذبذب بھی، جس کی طرف شاعر بار بار اشارہ کرتا ہے۔ یہ شاعر کا معاشرہ بھی ہو سکتا ہے جس سے وہ گہرے طور پر وابستہ ہے۔ ایسی غزلوں میں گھر کا استعارہ بار بار اُبھرتا ہے اور طرح طرح کی معنوی کیفیتیں پیدا کرتا ہے۔ شاعر اپنی زمین کو اپنا آخری حوالہ کہتا ہے اور مٹی کی دربدری کی دُہائی بھی دیتا ہے۔ اسے احساس ہے کہ ایک عمر گنوانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ جس میں رہ رہا تھا وہی گھر اُس کا نہ تھا۔ ان اشعار کے علامتی مفاہیم سے کوئی بھی سنجیدہ قاری سرسری نہیں گزر سکتا:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس کو گھر کر دے

یہ روشنی کے تعاقب میں بھاگتا ہوا دن
جو تھک گیا ہے تو اب اس کو مختصر کر دے

میں زندگی کی دُعا مانگنے لگا ہوں بہت
جو ہو سکے تو دُعاؤں کو بے اثر کر دے

میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا

اُجاڑ دے مری مٹی کو دربدر کر دے
مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا
اس ایک خواب کی حسرت میں جل بجھیں آنکھیں
وہ ایک خواب کہ اب تک نظر نہیں آیا
حریمِ لفظ و معانی سے نسبتیں بھی رہیں
مگر سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں آیا

خواب کی طرح بکھر جانے کو جی چاہتا ہے
ایسی تنہائی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے
گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں مگر جانے کیوں
شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

یہ اب کُھلا کہ کوئی بھی منظر مرا نہ تھا
میں جس میں رہ رہا تھا وہ گھر مرا نہ تھا
میں جس کو ایک عمر سنبھالے پھرا کیا
مٹی بتا رہی ہے وہ پیکر مرا نہ تھا
پھر بھی تو سنگسار کیا جا رہا ہوں میں
کہتے ہیں نام تک سرِ محضر مرا نہ تھا
سب لوگ اپنے قبیلوں کے ساتھ تھے

اک میں ہی تھا کہ کوئی بھی لشکر مرا نہ تھا

کہیں سے کوئی حرفِ معتبر شاید نہ آئے
مسافر لوٹ کر اب اپنے گھر شاید نہ آئے
قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو خیالِ بال و پر شاید نہ آئے
کسے معلوم اہلِ ہجر پر ایسے بھی دن آئیں
قیامت سر سے گزرے اور خبر شاید نہ آئے

ان اشعار میں گھر کی مرکزیت ظاہر ہے، گھر کے ساتھ مٹی، زمین اور دربدری کے انسلاکات بھی ہیں جو وطن کا صیغۂ اظہار ہیں۔ شاعر نے انھیں آج کے تناظر میں رکھ کے نئی معنوی وسعتیں پیدا کی ہیں جن کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا۔ غزل کی رمزیت کا جواز یہی ہے کہ ایسے اشعار خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر اور بعض اوقات بہ یک وقت دونوں سطحوں پر کام کرتے ہیں۔ گھر کو نجی، ذاتی معنی میں لیجیے تو بھی خالی از لُطف نہیں اور علامتی معنی میں لیجیے تو بھی معنی کے نئے امکانات سامنے آتے ہیں۔ اِفتخار عارف کی شاعری کے بارے میں اُوپر جو کچھ کہا گیا اس سے آسانی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ گہرا سیاسی احساس رکھتے ہیں اور طرح طرح کے جبر کے تئیں ان کا شعری ردِ عمل طرح طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔ اپنے اظہاری پیرایوں میں اُنھوں نے اُردو کی شعری روایت سے بھی استفادہ کیا ہے اور انفرادی علائم کو بھی برتا ہے۔ اس طرح اُنھوں نے اپنا ایک انفرادی لہجہ پیدا کیا ہے جو آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ زمینی اور ذہنی جلاوطنیوں کے حوالے، معرکۂ لہو، دشت، پیاس، نوکِ سناں، لشکر، شہر، بستی، گھر، گھرانا، مٹی زمین، دربدری وہ کلیدی علائم ہیں جن سے افتخار عارف کی شعریات کا شناخت نامہ مرتب ہوتا ہے۔ اس سے افتخار عارف نے ایک نئی معنوی فضا خلق کی ہے جس میں جبر کے پنجے میں تڑپتی ہوئی انسانیت کی کراہ سنائی دیتی ہے۔ یہ اُس طرح کی سیاسی شاعری نہیں جو لیک پر چلنے کی پابند ہوتی ہے۔ اس بات کے ثبوت میں افتخار عارف کا پورا دیوان پیش کیا جاسکتا ہے۔

بہت سے اشعار اُوپر درج کیے گئے۔ میں اقتباسات کو کم سے کم رکھنا چاہتا ہوں لیکن بعض اشعار گرفت میں لے لیتے ہیں اور اُن سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ سرسری گزرنے والوں سے شکایت نہیں، لیکن جو شعر کا مطالعہ سنجیدگی سے کرتے ہیں، انھیں اتفاق ہوگا کہ اُوپر جو مقدمہ پیش کیا گیا اس کی توثیق کے لیے ان اشعار کو نظر میں رکھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا بھی ضروری ہے:

اب بھی توہینِ اطاعت نہیں ہوگی ہم سے
دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
رزق برحق ہے، یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے

اجرتِ عشق وفا ہے تو ہم ایسے مزدور
کچھ بھی کرلیں گے یہ محنت نہیں ہوگی ہم سے

ہر نئی نسل کو اک تازہ مدینے کی تلاش
صاحبو! اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے

یہ بستی جانی پہچانی بہت ہے
یہاں وعدوں کی ارزانی بہت ہے

شگفتہ لفظ لکھے جارہے ہیں
مگر لہجوں میں ویرانی بہت ہے

بادل بادل گھومے پر گھر لوٹ کے آنا بھولے ناں
اللہ سائیں ڈار سے بچھڑی کونج ٹھکانا بھولے ناں

جب کبھی اُجلے اُجلے دِن پر ٹوٹ کے برسی کالی رات
ایک اپنی بستی کے نام کا دیا جلانا بھولے ناں

باغ بغیچے میرے جب جب نذر لہو کی چاہیں

میری برکت والی مٹی مجھے بلانا بھولے ناں

اس بار بھی دنیا نے ہدف ہم کو بنایا
اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے
بیچ آئے سر قریۂ زر جوہر پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے
مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

نئے سکندر ہیں اور ظلمات کا سفر بھی نیا نیا ہے
فریب کی منزلوں میں اندازِ حیلہ گر بھی نیا نیا ہے
کڑی کمانوں کے تیر بے اعتبار ہاتھوں میں آ گئے ہیں
دعا نئی تھی، سو اب یہ خمیازۂ اثر بھی نیا نیا ہے

کوئی جنوں کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے
بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے
ہوا بھی ہو گئی میثاقِ تیرگی میں فریق
کوئی چراغ نہ اب رہگزر میں رکھا جائے
اسی کو بات نہ پہنچے جسے پہنچنی ہو
یہ التزام بھی عرضِ ہنر میں رکھا جائے

کس قیامت خیز چپ کا زہر سناٹے میں ہے
میں جو چیخا ہوں تو سارا شہر سناٹے میں ہے

ایک ایک کر کے ستارے ڈوبتے جاتے ہیں کیوں
جاگتی راتوں کا پچھلا پہر سناٹے میں ہے

افتخار عارف کے یہاں عشقیہ جذبات کا اظہار بالذات طور پر بھی ہوا ہے۔ عشقیہ جذبات سے مراد محض سنِ بلوغ کے جذبات کا اظہار نہیں، اگرچہ محبت کے معصوم جذبات کی حامل کچھ غزلیں اور نظمیں اُن کے مجموعے میں مل جائیں گی لیکن یہ غالب رُجحان نہیں۔ عام کیفیت اس محبت کی ہے جو گرم و سردِ زمانہ کو دیکھ چکی ہے اور جس پر کئی جاڑے اور کئی برساتیں گزر چکی ہیں۔ ایسے اشعار میں محبت سے زیادہ، محبت کی خلش کا احساس ہے۔ ان میں ایسے بادل کی کیفیت ہے جو ویران کھیتوں پر برسنے کے بعد ہوا کے دوش پر اُڑا جا رہا ہو۔ کہیں کہیں توفیقِ گناہ کی خواہش بھی ہے جو تہذیبِ باطن کی راہ سے تصدیق الہٰ چاہتی ہے۔ ایک نظم ''تکمیل'' میں شاعر نے گناہ کو منتہائے سرشتِ آدم کہا ہے۔ کیوں کہ گناہ تخلیق کا ثمر ہے اور ایسا پیڑ ہے جس کے سائے میں مطمئن نفس اپنے پیکر کو ازسرِ نو تراشتا ہے۔ زیادہ تر نظموں میں خوف کے موسم کی کیفیت ہے، جبر کی وحشت ہے جس نے روح کو جکڑ لیا ہے عذابِ دربدری، بے گھری اور بے زمینی کے پیکر نظموں میں بھی بار بار اُبھرتے ہیں۔ شاعر جھوٹی بشارتوں کی ضمانت نہیں دیتا، وہ دیکھتا ہے کہ آرزو مند آنکھیں، بشارت طلب دل اور دُعاؤں کو اُٹھے ہوئے ہاتھ سب بے ثمر ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتا ہے کہ جب کبھی رنگوں، خوشبوؤں، پھولوں، آوازوں اور خوابوں کی توہین کی جائے گی، عذاب زمینوں پر آتے رہیں گے۔ اُسے دُکھ ہے کہ اہلِ اعتبار کتنے بدنصیب ہو گئے ہیں کیوں کہ ان سے قرضِ آبرو بھی ادا نہیں ہوتا، چنانچہ شاعر قرآن مجید کا یہ فرمان دُہرانے پر مجبور ہے:

اِنّی کُنتُ مِنَ الظّٰلِمِین

پڑھا تو یہ تھا کہ ہم ثمرِ کشتِ خاشاک کرنے والے نہیں رہیں گے
سنا تو یہ تھا ہم کے ہاتھوں پہ بیعتِ خاک کرنے والے نہیں رہیں گے
مگر ہوائیں کہ نیزہ تمام پر سرِ آفتاب آیا
امانت اور جس کے ہاتھوں میں تھی اُسی پر عذاب آیا

اور اب مرے کم حلیف و کم حوصلہ قبیلے کے لوگ مجھ سے یہ پوچھتے ہیں

ہماری قبریں کہاں بنیں گی؟

خیامِ تسلیم و سائبانِ رضا کی ویرانیاں بتائیں

جو اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کا خون دیکھیں، اب ایسی مائیں کہاں سے لائیں!

ایک اور نظم میں اس صورتِ حال کو یوں پیش کیا ہے:

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر

سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں

سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں

گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندی ہوئی روشنی

مقتل سے دریا تک پھیلی ہوئی روشنی

سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں

ایسے ہر منظر کے بعد اک سناٹا چھا جاتا ہے

یہ سناٹا طبل و علم کی دہشت کو کھا جاتا ہے

سناٹا فریاد کی لے ہے احتجاج کا لہجہ ہے

یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے بہت پرانا قصہ ہے

ہر قصے میں صبر کے تیور ایک طرح کے ہوتے ہیں

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر

سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں

(ایک رُخ)

اس پیرایے میں افتخار عارف کی کئی نظمیں ہیں جو تاثر کے اعتبار سے جھنجھوڑتی ہیں۔ ان میں "آخری آدمی کا رجز"، "قصہ ایک بسنت کا"، "جہانِ گم شدہ"، "ایک اُداس شام کے نام"، "پتا نہیں کیوں"، "التجا"، "دعا"، "اعلان نامہ" قابلِ ذکر ہیں۔ "بارہویں کے بیٹے" میں اس عہد کا فرد محسوس کرتا ہے کہ فرعون کا ایک لشکر ہے اور فرد اکیلا ہے اور اس کے ہاتھ عصا سے

خالی ہیں، ایسے میں بستی ذوبجز ہو جاتی ہے اور موت مقدر ہو جاتی ہے۔ التجا اور دعا کا پیرایہ کئی جگہ ملتا ہے

کوئی تو پھول کھلائے دُعا کے لہجے میں
عجب طرح کی گھٹن ہے ہوا کے لہجے میں

اگرچہ شاعر چاہتا ہے کہ کوئی معجزہ رونما ہو اور زمینوں کی عظمتیں پھر سے لوٹ آئیں لیکن اُسے معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوگا کیوں کہ انسان پا برہنہ سرکوچہ احتیاج رزق کی مصلحت کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے آبا و اجداد نے حرمتِ آدمی کے لیے اور کلمۂ حق کے لیے صلیبوں پر جو خون بہایا تھا وہ لہو اب نہیں بولتا ہے۔ آج کے انسان کو تاریخ کے شہسواروں کا خون آواز نہیں دیتا، اس کے سامنے اس کے قبیلے کی خیمہ گاہیں جلائی جاتی ہیں لیکن وہ تماشائی بنا رہتا ہے۔ شاعر نے ان لوگوں کی بیلنس شیٹ بھی مرتب کی ہے جنھوں نے رشتۂ شہرتِ عام کو توڑنے کی ہمت دکھائی اور شہرِ نمود و نام کو تج دینے کا حوصلہ بھی کیا، لیکن اندر کا کمزور آدمی صبح و شام ڈرانے آ جاتا ہے۔

نئے سفر میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے، یہ سمجھانے آ جاتا ہے! (بیلنس شیٹ)

افتخار عارف کی نظم "بارھواں کھلاڑی" خاصی مشہور ہے۔ اس نظم کو جبر، پامردی، احتجاج اور خوف، بزدلی، مفاہمت کے ان تضادات کے تناظر میں پڑھیے جو افتخار عارف کی شاعری اُبھارتی ہے تو اس نظم کی پوری معنویت اجاگر ہوتی ہے:

خوش گوار موسم میں
ان گنت تماشائی
اپنی اپنی ٹیموں کو
داد دینے آتے ہیں
اپنے اپنے پیاروں کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں
میں الگ تھلگ سب سے
بارھویں کھلاڑی کو

تنٹ کرتا رہتا ہوں
بارھواں کھلاڑی بھی
کیا عجب کھلاڑی ہے
کھیل ہوتا رہتا ہے
شور مچتا رہتا ہے
داد پڑتی رہتی ہے
اور وہ الگ سب سے
انتظار کرتا ہے
ایک ایسی ساعت کا
ایک ایسے لمحے کا
جس میں سانحہ ہوجائے
پھر وہ کھیلنے نکلے
تالیوں کے جھرمٹ میں
ایک جملۂ خوش کن
ایک نعرۂ تحسین
اس کے نام پر ہوجائے
سب کھلاڑیوں کے ساتھ
وہ بھی معتبر ہوجائے
پر یہ کم ہی ہوتا ہے
پھر بھی لوگ کہتے ہیں
کھیل سے کھلاڑی کا
عمر بھر کا یہ رشتہ
چھوٹ بھی تو سکتا ہے

آخری وصل کے ساتھ
ڈوب جانے والا دِل
ٹوٹ بھی تو سکتا ہے
تم بھی افتخار عارف
بارھویں کھلاڑی ہو
انتظار کرتے ہو
ایک ایسے لمحے کا
ایک ایسی ساعت کا
جس میں حادثہ ہو جائے
جس میں سانحہ ہو جائے
تم بھی افتخار عارف
تم بھی ڈوب جاؤ گے
تم بھی ٹوٹ جاؤ گے

(بارھواں کھلاڑی)

ہم زندگی کے کھیل میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی اپنی باری کے منتظر ہیں۔ کون میدان میں ہے اور کون میدان سے باہر، کسی کو خبر نہیں۔ جو میدان میں ہیں اور احساس کی دولت سے بہرہ مند ہیں وہ جانتے ہیں کہ جو میدان میں ہیں وہ بھی میدان سے باہر ہیں۔ یہ کیفیت اس بے زمینی اور بے گھری سے الگ نہیں ہے جس کا ذکر مضمون کے شروع میں کیا گیا ہے۔ ایک زمین ہمارے وجود سے باہر ہے، ایک ہمارے دل کے اندر ہے۔ زندگی کرنے یا زندگی کی دہشت اور اس کے جبر سے مقابلہ کرنے کے لیے، یا سیاسی ظلم و استبداد کے خلاف نبرد آزما رہنے کے لیے، بار بار دل کی زمین کی طرف لوٹنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان جتنا نہاں خانۂ باطن میں جھانکتا ہے، اتنا نیا ہوتا ہے، اس کا ایمان تازہ ہوتا ہے، اور زندگی کے دُکھ اور درد اور ظلم و جور سے پنجہ لڑانے کی تابِ مقاومت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مکالمہ سننے سے تعلق رکھتا ہے:

''ہوا کے پردے میں کون ہے جو چراغ کی لو سے کھیلتا ہے

کوئی تو ہوگا

جو خلعتِ انتساب پہنا کے وقت کی رو سے کھیلتا ہے

کوئی تو ہوگا

حجاب کو رمزِ نور کہتا ہے اور پرتو سے کھیلتا ہے

کوئی تو ہوگا!''

''کوئی نہیں ہے

کہیں نہیں ہے

یہ خوش یقینوں کے، خوش گمانوں کے واہمے ہیں جو ہر سوالی سے بیعتِ اعتبار لیتے ہیں

اس کو اندر سے مار دیتے ہیں

کوئی نہیں ہے

کہیں نہیں ہے۔''

''تو کون ہے وہ جو لوحِ آبِ رواں پہ سورج کو ثبت کرتا ہے اور بادل اُچھالتا ہے

جو بادلوں کو سمندروں پر کشید کرتا ہے اور بطنِ صدف میں خورشید ڈھالتا ہے

وہ سنگ میں آگ، آگ میں رنگ، رنگ میں روشنی کا امکان رکھنے والا

وہ خاک میں صوت، صوت میں حرف، حرف میں زندگی کا سامان رکھنے والا

نہیں کوئی ہے

کہیں کوئی ہے

کوئی تو ہوگا!!''

(مکالمہ)

ان چند صفحات میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ افتخار عارف نے اپنے تخلیقی سفر میں جس ملکِ سخن کو دریافت کیا ہے، اس کے خاص خاص منطقوں کی کچھ آگہی حاصل ہو جائے۔ ان کی قلمروِ شعر میں وادیاں بھی ہیں اور چوٹیاں بھی، درد کے گھنے جنگل بھی ہیں اور رُوح کی گہرائیوں

میں بہنے والی سرخ سیر ندیاں بھی۔ کہیں انسانی رشتوں کی چاندنی ہے اور کہیں ظلم کے طوفانوں نے عافیت کے خیموں کی طنابیں کاٹ دی ہیں۔ دشتِ بلا میں سموم اور صرصر کی آندھیاں چل رہی ہیں اور پیاسی ریت میں انسان کا لہو قطرہ قطرہ جذب ہو رہا ہے۔ اس منظر نامے کا پورا تعارف خود شاعری ہے۔ اس مسافت کے لیے ضروری ہے کہ دیدۂ بینا خود بابِ سخن وا کرے۔ افتخار عارف نے بس درد کی صلیب اٹھائی ہے وہ ہمارا اور ہمارے عہد کا درد ہے، سب کا درد ہے لیکن اس میں انفرادی شان انھوں نے اس طرح پیدا کی ہے کہ اس درد کو انھوں نے بے زمینیوں کے احساس کے ساتھ قبول کیا ہے اور اس میں بستیوں، شہروں اور مٹیوں کی عظمت کے ساتھ ساتھ گھر دہلیز کی حرمتوں کا دکھ درد فنی خلوص کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ وہ آج کے انسان کا المیہ بیان کرتے ہیں۔ لیکن ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے نہ نوحہ گری کی ہے نہ رجز خوانی، بس دردِ دل رقم کر دیا ہے۔ ان کا درد ایسی قوت ہے جو باطن کا نور بن کر وجود کو منور کر دیتا ہے۔ ان کا پیرایہ بالعموم رمزیہ اور علامتی ہے لیکن ان کا لہجہ نامانوس نہیں۔ اس میں ایسی کشش اور دل آویزی ہے جو ان کی اپنی ہے۔ افتخار عارف کا شیوۂ گفتار کلاسیکی رچاؤ، شائستگیِ اظہار، گہری دردمندی اور شدتِ احساس سے عبارت ہے۔ اس میں جو قوتِ نمو ہے اور انفس و آفاق سے اسے جو نسبت ہے، اس کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ اس آواز کے نغمے تازہ و شیریں رہیں گے۔

○

پروفیسر فتح محمد ملک

افتخار عارف کا کارنامۂ خاص

(۱)

افتخار عارف انحراف کے زمانے میں اثبات کا شاعر ہے۔ جس زمانے میں مسلمانوں کی ادبی اور فکری روایت سے بے رخی سکۂ رائج الوقت تھا۔ عین اس زمانے میں افتخار عارف نے ہماری اپنی ادبی اور فکری روایت کی تردید کے چلن سے بغاوت کر کے مسلمانوں کی انسان دوست، روشن خیال اور ترقی پسند ادبی و فکری روایت کے تخلیقی اثبات کا رویہ اپنایا۔ میں افتخار عارف کے اس فنی نقطۂ نظر کو تاریخی اور تخلیقی ہر دو اعتبار سے ایک کارنامۂ خاص قرار دیتا ہوں۔

(۲)

تاریخِ انسانی میں سب سے پہلے اسلام نے خاندانی بادشاہت کے تصور کو رد کیا۔ اسلام نے قیصر و کسریٰ کے امتیازات کو مٹا کر ''ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم'' کے خالص انسانی معیار کو شرف و عظمت کی معتبر بنیاد قرار دیا۔ یوں خاندانی شہنشاہیت کا بت پاش پاش ہوا اور اس کی جگہ عظمتِ کردار اور خدمتِ آدمی پر مبنی خلافتِ اسلامی کا تصور جاگزیں ہوا، مگر مرورِ ایام کے ساتھ خلافت آہستہ آہستہ پھر سے ملوکیت سے قریب ہونے لگی اور بالآخر یزید نے خلافت کو خاندانی بادشاہت میں تبدیل کر کے اسلام کے سیاسی نظام کو رد کر دیا۔ حضرت امام حسینؓ نے اپنی بے سروسامانی اور اپنے عہد کی باطل پرستی کے باوجود شہنشاہیت کے اس غیر اسلامی تصور کو

چیلنج کیا۔ آپ نے انتہائی نامساعد حالات میں باطل کے ساتھ صلح کرنے کی بجائے حق کی سربلندی کی خاطر جان دے کر اسلام کو مٹنے سے بچایا۔ حضرت امام حسینؓ ان کے اہلِ خاندان اور رفیقان جاں نثار کی یہ قربانی مسلمانوں کے ادب میں صدیوں سے جاری سرچشمۂ فیضان کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ باطل کی اندھی قوت کے مقابل حق کے ڈٹ جانے کی یہ ادا ہمارے صوفیوں، شاعروں اور ادیبوں کو نت نئی تخلیقی زرخیزی دیتی چلی آئی ہے۔ مسلمانوں کے ادب میں نہ تو واقعۂ کربلا صرف اور محض ایک تاریخی واقعہ ہے اور نہ شہدائے کربلا صرف و محض تاریخی کردار ہیں۔ یہ لوگ تو زمان و مکان سے ماورا زندہ و منور استعارے ہیں جو ظلم و استبداد کے اندھیروں میں ہمیشہ مینارۂ نور کی مانند درخشاں رہتے ہیں۔ یہی ہے وہ مفہوم جس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جنابِ امام حسینؓ کو بنائے لا الٰہ قرار دیا تھا اور اقبال نے کہا تھا:

تا قیامت قطعِ استبداد کرد
موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

اگر ہم خود کو صرف اُردو دُنیا تک محدود رکھیں تو ہمیں اُردو زبان میں ادبی اظہار کے آغاز سے لے کر عہدِ حاضر تک شہدائے کربلا کا فیضان نمایاں نظر آئے گا۔ شعر و شاعری کے میدان میں ولی سے لے کر اقبال اور ندیم تک اور نثر کے میدان میں فضلی کی کربل کتھا سے لے کر قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے افسانوں تک ہمیں جرأت و شجاعت اور ایثار و جاں فروشی کے اس عظیم رزمیہ کی عیاں یا نہاں جھلک ضرور نظر آئے گی۔ ہر زمانے میں اثر و تاثیر اور فیض و اکتساب کے اُسلوب بدلتے رہے ہیں مگر مقامِ شبیری ایک ابدی حقیقت بن کر اُردو ادب کے قالب اور رُوح دونوں کو برابر زندگی اور توانائی بخشتا رہا ہے۔

اردو ادب کی ابتدائی نشو و نما چوں کہ زوال کے زمانے میں ہوئی تھی اس لیے قدیم ادب میں سانحۂ کربلا کا بیان زوال و ابتری کے زمانے کے معاشرتی اور اخلاقی تقاضوں کے حوالے سے ملتا ہے۔ اس اندازِ فکر و اظہار کا نکتۂ عروج انیس اور دبیر کے مرثیوں میں نظر آتا ہے۔ انیس و دبیر گویا مرثیہ گوئی سے اپنے زمانے کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زوال کے سامنے بند باندھنے اور اپنے ہم نفسوں کو زوال و ادبار کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھی شہدائے

کربلا کی جرأتِ فکر و عمل سے روشنی لینے کا درس دیتے ہیں۔ چناں چہ عہدِ قدیم کے ادب میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور ڈرامائیت کے فنی ساز و سامان کے ساتھ سانحۂ کربلا کو ہمارے خاص قومی پس منظر میں از سرِ نو زندہ کیا گیا۔ لیکن حالی کی مسدس سے شروع ہونے اور اقبال کے ہاں تکمیل کو پہنچنے والے جدید ادب میں اس سانحے کو ادب کے خمیر و ضمیر میں حل کر لیا گیا۔ انیس کے ہاں سانحۂ کربلا کا غم اگر ہمارے ادب کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بن کر رواں ہے تو اقبال کے ہاں یہی غم ہمارے ادب کے رگ و پے میں اُترتا اور ایک نیا چمن ایجاد کرتا نظر آتا ہے۔ اقبال کے ہاں امام حسینؑ ماضی کی ایک عظیم ہستی بھی ہیں، حال کا سرمایۂ افتخار بھی ہیں اور مستقبل کی ایک پُرسوز اور تابناک آواز بھی:

چشمِ حجاز منتظر، ریگِ عراق تشنہ کام
خونِ حسینؑ باز دہ، کوفہ و شامِ خویش را

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اس اعتبار سے دیکھیں تو سانحۂ کربلا اقبال کی شاعری میں زمان و مکان کی حدود توڑ کر ایک بسیط کائناتی پس منظر بن گیا ہے۔ انسانی ارتقا اور خیر و شر کی ازلی و ابدی کشمکش اس سانحے کی نسبت سے بیان ہوتی ہے:

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؓ
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

اقبال کے ہاں موسیٰ و فرعون، مصطفیٰ و بولہب اور شبیرؓ و یزید فقط تاریخی کردار ہی نہیں بلکہ خیر و شر کی ازلی کشمکش کے استعارے ہیں۔ اقبال نے ان جیسے درجنوں تاریخی کرداروں کو مسلمانوں کے ماضی کی پرستش کے جذبے سے نہیں بلکہ انسانوں کے ابد تک پھیلے ہوئے مستقبل کو روشن کرنے کی خاطر آفاقی استعاروں میں بدل دیا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد میں برپا حق و باطل کے تصادم کے گوناگوں نقوش کو اسلامی تاریخ کے ان کرداروں کی وساطت

سے یوں اُبھارا ہے کہ انسانی ارتقا کی پوری سرگزشت ان کرداروں کے فکر و عمل میں منعکس ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ عکاسی ایسے فنی اعجاز کے ساتھ کی گئی ہے کہ عصرِ رواں کا سوز و ساز، دورِ رفتہ کے درد و داغ اور زمانِ آئندہ کی جستجو و آرزو سے ہم آغوش ہو کر لازمانی اور لامکانی حسن کو آواز دینے لگا ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات میں انسان کا انفرادی اور اجتماعی مقدر ہو یا انفس و آفاق میں برپا خیر و شر کا تصادم ہو یا انسان کی غیر مختتم آرزوئیں اور ہمیشہ تشنۂ تکمیل رہنے والی جستجوئیں ہوں، اقبال ان کی تخلیقی تفہیم و تعبیر اور ان کی فنی و جمالیاتی صورت گری کے عمل کو اصنامِ خیالی (مائی تھالوجی، دیو مالا) کی تیرہ و تار فضا میں نہیں سرانجام دیتے بلکہ اسلامی تاریخ کی حقیقی دُنیا کی دھوپ کی طرح روشن اور چاند کی طرح اجلی فضا میں لے آتے ہیں۔ ان کے استعارے توہماتی قصے کہانیوں کے فرضی کرداروں کی بجائے حقیقی انسانی تاریخ کے اسلامی دور کے جیتے جاگتے، دیکھے بھالے اور وقت کی کڑی آزمائش پر پورے اُترتے ہوئے کرداروں سے ماخوذ ہیں۔ دیو مالا کی بجائے تاریخ پر اس انحصار نے جہاں شاعرانہ صداقت کو سائنسی صداقت کی سوت نہیں بلکہ زوجین بنا دیا ہے، وہاں ان کی آفاقیت کو ایک نمایاں اسلامی شناخت بھی بخشی ہے۔ یہ جداگانہ اسلامی شناخت اُوپر سے مسلط کی گئی شناخت نہیں بلکہ سرزمین کے قلب سے قدرتی طور پر یوں پھوٹتی ہوئی شناخت ہے جیسے شاخِ گلاب سے گلاب کا پھول پھوٹتا، کھلتا اور دلِ صد چاک کی مانند اپنے باطنی حسن کو خارجی قالب عطا کر دیتا ہے۔

آفاقی ادب کی اس اسلامی شناخت کے خلاف اقبال کی زندگی ہی میں ردِ عمل شروع ہو گیا تھا۔ رواں صدی کی تیسری دہائی میں مارکس کے معاشی ہمہ اوست اور فرائیڈ کے جنسی ہمہ اوست کے سیکولر تصورات کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والی نسلوں کے ادیبوں نے اقبال کے روحانی ہمہ از اوست سے پھوٹنے والے تصورِ کائنات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے نام پر آفاقی ادب کی اسلامی شناخت کی نفی میں ایک ایسی ادبی روایت کی تخلیق و ترویج عمل میں آئی جو تاریخی صداقت کی بجائے دیو مالا کے افسانہ و افسوں کو زیادہ معتبر قرار دیتی ہے۔ جدید اور جدید تر مغربی ادب تو اس بنا پر یونانی علم الاصنام اور ہندوستانی دیو مالا کے کرداروں اور کہانیوں کے پس منظر میں عصری زندگی کے عذاب ثواب کی

عکاسی پر نازاں ہے کہ ان کے تہذیبی خزانے میں اسلامی تاریخ کا عمل دخل کبھی نہیں رہا۔ اس کے برعکس تقلید کی روش اپنا کر ہمارا تخلیقی فن کار جدیدیت کا علم لہرانے لگا۔ اقبال تہذیبی خودکشی کے اس عمل کو ایک گونہ اضطراب سے دیکھتے اور نوجوان فن کار کو خبردار کرتے رہے کہ جن فکری اور تخلیقی فیشنوں پر وہ اپنی عقل ہارنے میں مصروف ہیں وہ تو افرنگ میں بھی فرسودہ ہو چکے ہیں، ...تازہ اش جز کہنہ افرنگ نیست... اور:

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

اقبال ان لوگوں کو مقلد بننے کی بجائے صاحب ایجاد ہونے کی تلقین کرتے رہے مگر یہ لوگ اقبال کی مسلمانوں کے مقدر کے ساتھ جبلی وابستگی کو قدامت پسندی سمجھ کر مارکس اور فرائیڈ کے دبستانوں میں مقبول ہونے والے سیکولر تصورات کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائے رہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت ہر دو تخلیقی کاروانوں میں عہد کے ذہین ترین اور خلاق ترین نوجوان شامل تھے۔ اس لیے ان کی تخلیقات نے اردو ادب میں مغربی ادبی و فکری روایت کی تقلید میں ایک نئی روایت بنائی، اسے رواج دیا اور لگ بھگ نصف صدی تک اس روایت کا بول بالا رکھا۔ اس نئی روایت نے اردو ادب میں تین لاوارث نسلیں پیدا کیں۔ لاوارث اس لیے کہ ان لوگوں نے شعوری طور پر خود کو مسلمانوں کی ادبی و فکری تاریخ اور مسلمانوں کے ادبی و فنی سانچوں سے دستبردار اور مارکسی ادبی منصوبہ بندی اور فرائیڈی تاریک اندیشی کا علم بردار ٹھہرایا۔ افتخار عارف نے اس مقلدانہ روایت کو دور سے سلام کیا اور اپنے اور اپنی ملت کے من میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پانے کا کٹھن تخلیقی مرحلہ سر کرنے کی ٹھانی۔ کیوں نہ ہو:

مدینہ و نجف و کربلا میں رہتا ہے
دل ایک وضع کی آب و ہوا میں رہتا ہے

وہ لکھنؤ ہو یا کراچی، لندن ہو یا اسلام آباد — افتخار عارف خارج کے آب و باد و حالات کے کرم اور ستم کی پذیرائی اپنے باطن کی آب و ہوا میں سانس لیتے ہوئے کرتا ہے اور اقبال کی آواز کو اپنے دل کی آواز بناتا ہے:

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

یوں افتخار عارف نے اقبال کی انقلابی شاعری سے اردو شاعری کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جوڑ کر ایک نئے انداز کی ترقی پسند شعری روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ وہ عصرِ حاضر میں معاشی اور معاشرتی عدم مساوات اور سیاسی جبر و استبداد کی ترویج میں ہمہ تن منہمک قاہر و جابر قوتوں کو للکارتے وقت اسلامی تاریخ سے جس طرح روشنی اور قوت اخذ کرتے ہیں اس کی بہترین مثال ابو ذر غفاریؓ اور اسامہ بن زیدؓ پر ان کی نظمیں ہیں۔ اپنے انقلابی مسلک سے پھوٹی ہوئی ان نظموں میں افتخار عارف نے بے شک ان تاریخی شخصیات سے اپنی اٹوٹ محبت کی بنا پر اعتنا کیا ہے مگر خدا لگتی کہتا ہوں کہ انسانی تاریخ کے علاوہ دُنیائے انسانیت کے اصنامِ خیالی میں بھی ان انقلابی تصورات کی مکمل تجسیم کہیں اور نہیں ملتی۔ ''ابو ذر غفاریؓ کے لیے ایک نظم'' کا آخری حصہ بتاتا ہے کہ یہ نظم ابو ذر غفاریؓ کے لیے نہیں بلکہ میرے آپ کے لیے اور میری آپ کی آئندہ نسلوں کے لیے ہے:

مگر زمانے نے یہ بھی دیکھا
وہی مدینہ ہے اور ابو ذرؓ ہیں اور منبر ہے اور منبر کا فیصلہ ہے
اور اب جو منبر کا فیصلہ ہے وہ قولِ صادقؐ سے مختلف ہے
جو قولِ صادقؐ سے مختلف ہے وہ فیصلہ میرے اور منبر کے درمیان
اک سوال بن کر ٹھہر گیا ہے
بہت زمانہ گزر گیا ہے مگر ابو ذرؓ نگاہ میں ہیں
پسِ کمیں گاہ جبر زر آوروں کی سازش کے سارے منظر
نگاہ میں ہیں
دمشق و بغداد و قرطبہ کے سلاسلِ مصلحت کی بخشش
پہ پلنے والے تمام منبر نگاہ میں ہیں

جہانِ مظلوم خوابِ دیگر کا منتظر ہے
نیا زمانہ۔ نئے ابوذرؓ کا منتظر ہے

اسلامی انسان دوستی کے مثالی تصورات کو نامساعد ترین حالات میں اپنی اور اپنے عصر کی عملی زندگی میں جلوہ گر دیکھنے کی تمنا میں حضرت ابوذرؓ نے جس استقامت، ایثار اور عشقِ رسولؐ کی مثال پیش کی ہے، افتخار عارف اسے عصرِ رواں اور زمانِ آئندہ کے جبر و استبداد سے نجات دلانے کے جہاد میں سرچشمۂ فیضان سمجھتے ہیں۔ اسی طرح رنگ و نسل کے تعصبات سے عہدِ حاضر کو آزاد دیکھنے کی تمنا افتخار عارف کو اس دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کُل کے انقلابی کردار کی ایک بار پھر تحسین کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جس نے غبارِ راہ کو فروغِ وادیِ سینا بخشا تھا یعنی جس نے گری پڑی اور ٹھکرائی ہوئی مخلوق سے محبت کو اللہ کی عبادت کا بلند ترین درجہ قرار دیا تھا اور جس نے حضرت اسامہؓ بن زید کو جو ایک آزاد غلام تھے، لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا۔ عرب قبائل کے ممتاز ترین نمائندوں کو ان کی اطاعت پر مجبور کیا اور یوں انھیں نام نہاد سردارانہ نخوت سے رہا کر کے انسانی مساوات کی عملی تربیت دی تھی۔ نظم کا آخری حصہ آپ کو خود ہی سب کچھ بتا دے گا، تو لیجیے پڑھیے:

اب بھی نخوت ہے وہی جبہ و دستار کے بیچ
وہی معیارِ شرف درہم و دینار کے بیچ
اک غلام ابنِ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام
اب بھی نرغے میں ہے اک شہرِ دل آزار کے بیچ
نرغۂ اہلِ تکبر سے نکالے مجھ کو
کوئی صدیقؓ نہیں ہے کہ بچالے مجھ کو

جب افتخار عارف ہمارے زمانے کی نئی جاہلیت کی قاہر و جابر قوتوں کو للکارتے وقت کسی ابوذرؓ، کسی صدیقؓ اور کسی حسینؓ کے نئے ظہور کی تمنا کرتے ہیں تو ان کی شاعری اقبال

کی شاعری کو آواز دینے لگتی ہے۔

وہی حرم ہے وہی اعتبارِ لات و منات
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری!

(۳)

جس زمانے میں افتخار عارف نے اپنی شاعری کا آغاز کیا وہ زمانہ ہمارے دار و رسن کی پرچھائیں سے فرار، عمل کی رائگانیت پر اصرار اور زندگی کی بے معنویت کے فلسفوں کے پرچار کا زمانہ تھا۔ نوجوان لکھنے والے ۱۹۳۶ء کے باغیوں کے خلاف بغاوت کی ذہن میں زندگی ہی سے منہ موڑ بیٹھے تھے اور ادب کی سماجی ذمہ داری اور ادب کے انقلابی کردار کے تصورات کو متنزل گرداننے لگے تھے۔ افتخار عارف اس رسم و رہِ عام سے ہٹ کر چلے اور انھوں نے معاشرتی اور تہذیبی وابستگی کو اپنے فن کا بنیادی حوالہ بنایا:

میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا
اُجاڑ دے مری مٹی کو در بدر کر دے
مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو معتبر کر دے

باغ بغیچے میرے جب جب نذر نہو کی چاہیں
میری برکت والی مٹی مجھے بلانا بھولے ناں

ہماری تہذیب میں زمین کی اہمیت فقط اس قدر ہے کہ یہ ہمارے اجتماعی خوابوں کا مستقر ہے۔ زمین ہمارے خواب کا بدن ہے۔ خواب نہیں تو جغرافیائی وجود کی مشتِ خاک، طوفانِ حوادث کے سامنے کہاں ٹھہر سکے گی؟ افتخار عارف کو اپنے خواب سے اٹوٹ وابستگی کا عہد اس لیے کرنا پڑا ہے کہ اس کے گرد و پیش لوگ خواب سے کٹ کر جینے میں مگن ہیں اور نہیں سوچتے کہ:

یہ تیرے میرے چراغوں کی ضد جہاں سے چلی
وہیں کہیں سے علاقہ ہوا کا لگتا ہے

ہوا بھی ہوگئی میثاقِ تیرگی میں شریک
کوئی چراغ نہ اب رہگذر میں رکھا جائے

جو ڈوبتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری
جو ٹوٹتا جاتا ہے وہ پیماں بھی مرا ہے
جو ہاتھ اُٹھے تھے، وہ سبھی ہاتھ تھے میرے
جو چاک ہوا ہے وہ گریباں بھی مرا ہے
مٹی کی گواہی سے بڑی دِل کی گواہی!
یوں ہو تو یہ زنجیر یہ زنداں بھی مرا ہے

افتخار عارف کے ہاں خواب اور خاک کا رشتہ کچھ یوں ہے کہ زمین بے شک اس کے لیے آخری حوالہ ہے مگر اس سے بھی عظیم تر صداقت یہ ہے کہ مٹی کی گواہی سے بڑی دل کی گواہی ہے۔ اس لیے زنجیر اور زنداں کا سامنا لازم ٹھہرا۔ فیض اور ندیم کے بعد کی نسلوں کے ترقی پسند شاعروں میں دار و رسن اور زندان و مقتل کی لکیر پیٹنے والوں کی کمی نہیں مگر افتخار عارف دو وجہ سے ان شاعروں سے نمایاں طور پر مختلف شخص اور شاعر ہے۔ اوّل یہ کہ اس کے ہاں جاں سپاری اور سرفروشی کے بلند بانگ مگر کھوکھلے اِدّعا کی بجائے سلامتیِ جسم و جاں کے لیے مفاہمت پسندی پر ندامت کا وہ جان سوز احساس کارفرما ہے جو خود احتسابی کی کٹھن راہ اپنانے کا ثمر ہے:

بیچ آئے سرِ قریۂ زر جوہرِ پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے

کہاں کا خیر کیسی حرمتِ لفظ و معانی
میں، دُنیا میں ہوں اور اسبابِ دُنیا چاہتا ہوں

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا
دمشقِ مصلحت و کوفۂ نفاق کے بیچ
فغانِ قافلۂ بے نوا کی قیمت کیا

قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو خیالِ بال و پر شاید نہ آئے

ہوسِ لقمۂ تر کھا گئی لہجے کا جلال
اب کسی حرف کو حرمت نہیں ملنے والی

اور دوم یہ کہ سرگزشتِ ملتِ بیضا اس کے فکروشعور کا سرچشمہ اور جذبہ و احساس کی جنم بھومی ہے۔ شہدائے کربلا کے ساتھ اپنی نسبتوں کا جیتا جاگتا احساس اس کے لیے فخر و ناز کا سرمایہ بھی ہے اور درد و کرب کا الاؤ بھی۔ شہدائے کربلا کے ساتھ اپنے ہم رشتہ ہونے کا شعور اسے اپنی اجتماعی ذمہ داری کی یاد برابر دلاتا رہتا ہے۔ چناں چہ وہ اپنے مقدر اور اپنی ہستی کے مصائب پر داستانِ حرم ہی کے سیاق و سباق میں غور و فکر کرتا ہے:

ملے تو کیسے ملے منزلِ خزینۂ خواب
کہاں دمشقِ مقدر کہاں مدینۂ خواب

میں وہ ہوں کہ میرے چہار سمت غنیم اور
مجھے اعتبار یسار کا نہ یمین کا

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوکِ سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

سیاہِ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے، پروردگارِ شب نکلا

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رَن پڑنا ہے اور گھمسان کا رَن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے

دل ان کے ساتھ مگر تیغ اور شخص کے ساتھ
یہ سلسلہ بھی کچھ اہلِ ریا کا لگتا ہے

وہ بستی جو افتخار عارف کی شاعری میں سہمی سہمی سانس لے رہی ہے اور جسے خود اس نے کہیں نابینا بستی کہا ہے، کہیں، قہرمان بستی کا نام دیا ہے اور کہیں شہرِ تذبذب سے موسوم کیا ہے، ظلم وستم کی لپیٹ میں ہے۔ اس بستی کے در و دیوار پر خوف و دہشت مسلط ہیں۔ اس کے مکین خیامِ تسلیم و سائبانِ رضا میں بیٹھے اپنی ہی آواز سے ڈر رہے ہیں۔ اپنے ہی چہروں سے شرما رہے ہیں اور اپنے ہی سائے سے گھبرا رہے ہیں۔ یہاں:

نہ اعتبارِ حرف ہے نہ آبروئے خون ہے

اور

فضا وہ ہے کہ آرزوئے خیر تک جنون ہے

سکون ہی سکون ہے

(آخری آدمی کا رجز)

اس بستی کے لوگ جنھیں افتخار عارف نے اپنی ایک نظم میں اہلِ انتظار قرار دیا ہے

ناخداؤں کے جور و جفا سے نجات کے لیے اپنے خدا کو یوں پکارتے ہیں:

شکاری اپنے باطن کی طرح اندھے شکاری

حرمتوں کے موسموں سے نابلد ہیں

اور نشانے مستند ہیں

جگمگاتی جاگتی شاخوں کو بے آواز رکھنا چاہتے ہیں

ستم گاری کے سب در باز رکھنا چاہتے ہیں

خداوندا! تجھے سہمے ہوئے باغوں کی سوگند

صداؤں کے ثمر کی منتظر شاخوں کی سوگند

اُڑانوں کے لیے پر تولنے والوں پر اک سایہ تحفظ کی ضمانت دینے والا

کوئی موسم بشارت دینے والا

(خوف کے موسم میں لکھی گئی ایک نظم)

اور اپنے مصائب پر اپنی تاریخ و تہذیب کی روشنی میں یوں تڑپ کر سوچتے ہیں:

تو کیا کوئی معجزہ نہ ہوگا؟

ہمارے سب خواب وقت کی بے لحاظ آندھی میں جل بجھیں گے

دونیم دریا و چاہِ تاریک و آتشِ سرد و جاں نوازی کے سلسلے ختم ہو گئے کیا؟

تو کیا کوئی معجزہ نہ ہوگا؟

خدائے زندہ! یہ تیری سجدہ گزار بستی کے سب مکینوں کی التجا ہے

کوئی تو ایسی سبیل نکلے کہ تجھ سے منسوب گُل زمینوں کی عظمتیں پھر سے لوٹ آئیں
وہ عفو کی، درگزر کی، مہر و وفا کی بھولی روایتیں پھر سے لوٹ آئیں
وہ چاہتیں وہ رفاقتیں وہ محبتیں پھر سے لوٹ آئیں

(استغاثہ)

نہیں بھائی نہیں، ملوکیت کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی التجائیں اللہ کریم نے کب سنی ہیں اور حکمتِ فرعونی کے سہارے قائم سیاسی اور اقتصادی نظام میں اسلامی اخلاق کیونکر پنپ سکتا ہے؟ جس معاشرے کی سیاسی اقدار دورِ جاہلیت سے مستعار ہوں اس میں اسلامی حریت و مساوات کا خواب دیکھنے والوں کا مقدر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے:

چھوٹے چھوٹے فرعونوں کا اک لشکر اور ایک اکیلا میں
میرے ہاتھ عصا سے خالی

(ابوالہول کے بیٹے)

یہ زمینوں آسمانوں کے عذاب اور میں اکیلا آدمی
میں اکیلا آدمی کب تک لڑوں
سارے دشمن درپئے آزار، لشکر صف بہ صف
لشکروں کے سب کمانداروں کے رُخ میری طرف
اور میں نہتا آدمی
میں نہتا آدمی کب تک لڑوں
میں اکیلا آدمی کیسے لڑوں

(ھل من ناصر ینصرنا)

شہرِ تذبذب میں فرعونوں کے لشکروں کے مقابلے میں اپنے یکہ و تنہا ہونے کا احساس افتخار عارف کو اماں گاہِ مصلحت میں لا بٹھاتا ہے مگر یہ سوال اسے یہاں بھی چین نہیں لینے دیتا اور ضمیر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے کہ:

میرے آبا و اجداد نے حرمتِ آدمی کے لیے
تا ابد روشنی کے لیے
کلمۂ حق کہا
مقتلوں، قید خانوں، صلیبوں میں بہتا لہو ان کے ہونے کا اعلان کرتا رہا
وہ لہو حرمتِ آدمی کی ضمانت بنا
تا ابد روشنی کی علامت بنا
اور میں پا برہنہ سرِ کوچۂ احتیاج
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی
سوچتا رہ گیا
جسم میں میرے اُن کا لہو ہے تو پھر یہ لہو بولتا کیوں نہیں؟

(ایک سوال)

اسلامی خواب و خیال اور روایات و اقدار سے اسلام کے نام پر منحرف ہو جانے والی دُنیا میں ان آئیڈیلز کی پاسداری کتنی کٹھن ہے، اس کا اندازہ شاعر کے اس تجربے سے کیجیے جو درجِ ذیل نظم کا صورت گر ہے:

یہ دُنیا ایک سؤر کے گوشت کی ہڈی کی صورت
کوڑھیوں کے ہاتھ میں ہے
اور میں نان و نمک کی جستجو میں در بدر قریہ قریہ مارا مارا پھر رہا ہوں
ذرا سی دیر کی جھوٹی فضیلت کے لیے
ٹھوکر پہ ٹھوکر کھا رہا ہوں ہر قدم پر منزلِ عز و شرف
سے گر رہا ہوں
اور مری انگشتری یا علیؑ لکھا ہوا ہے
مگر انگشتری پر یا علیؑ کندہ کرا لینے سے کیا ہوگا
کہ دل تو مرحبوں کی دسترس میں ہے

عجب عالم ہے آنکھیں دیکھتی ہیں اور دل سینوں میں اندھے ہو چکے ہیں

اور ایسے میں کوئی حرفِ دُعا اک خواب بنتا ہے

کبھی سلمانؓ آتے ہیں

کبھی بوذرؓ کبھی میثمؓ کبھی قنبرؓ مری ڈھارس بندھاتے ہیں

کمیلؓ آتے ہیں کہتے ہیں

''پکارو افتخار عارف پکارو

اپنے مولا کو پکارو، اپنے مولا کے وسیلے سے پکارو

''اجیب الدعوۃ الداعی'' کا دعویٰ کرنے والے کو پکارو

یہ مشکل بھی کوئی مشکل ہے دل چھوٹا نہیں کرتے

کریم اپنے غلاموں کو کبھی تنہا نہیں کرتے''۔

(یا سریع الرضا اغفرلمن لا یملک الا الدعا)

اس نظم کا شاعر اپنی فکری اور روحانی تنہائی کو قرنِ اول کی بہادر شخصیات کی فکری اور روحانی یگانگت سے انجمن آرائی کی شکل دیتا ہے، یوں جیسے اقبال نے کہا تھا:

از زمانِ خود پشیماں می شوم

در قرونِ مصطفیٰ پنہاں شوم

یہ قلب کی آنکھ سے دیکھنے والی ان شخصیات کا فیضان ہے کہ افتخار عارف — بالآخر یہ خون جوش مارتا ہے اور وہ خیمہ ٔ عافیت کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

میں جانتا تھا مرا قبیلہ بریدہ اور بے ردا سروں کی گواہیاں

لے کے آئے گا پھر بھی لوگ انکار ہی کریں گے

سو میں کمیں گاہِ عافیت میں چلا گیا تھا

سو میں اماں گاہِ مصلحت میں چلا گیا تھا

اور اَب مجھے میرے شہسواروں کا خون آواز دے رہا ہے

تو نذرِ سر لے کے آ گیا ہوں
تباہ ہونے کو ایک گھر لے کے آ گیا ہوں
میں لاکھ بزدل سہی مگر میں اُسی قبیلے کا آدمی ہوں

(اعلان نامہ)

تذبذب سے یقین تک اور مفاہمت سے مزاحمت تک یہ ذہنی اور جذباتی ارتقا افتخار عارف کو اقبال کی انقلابی شعری روایت اور میرے دل سے قریب لے آتا ہے۔ اقبال تک پہنچی ہوئی اور اقبال کے ہاں نیا رنگ و آہنگ اختیار کرتی ہوئی مسلمانوں کی ادبی روایت کب سے اپنے وارثوں کی منتظر ہے۔

آخری آدمی کا رَجز
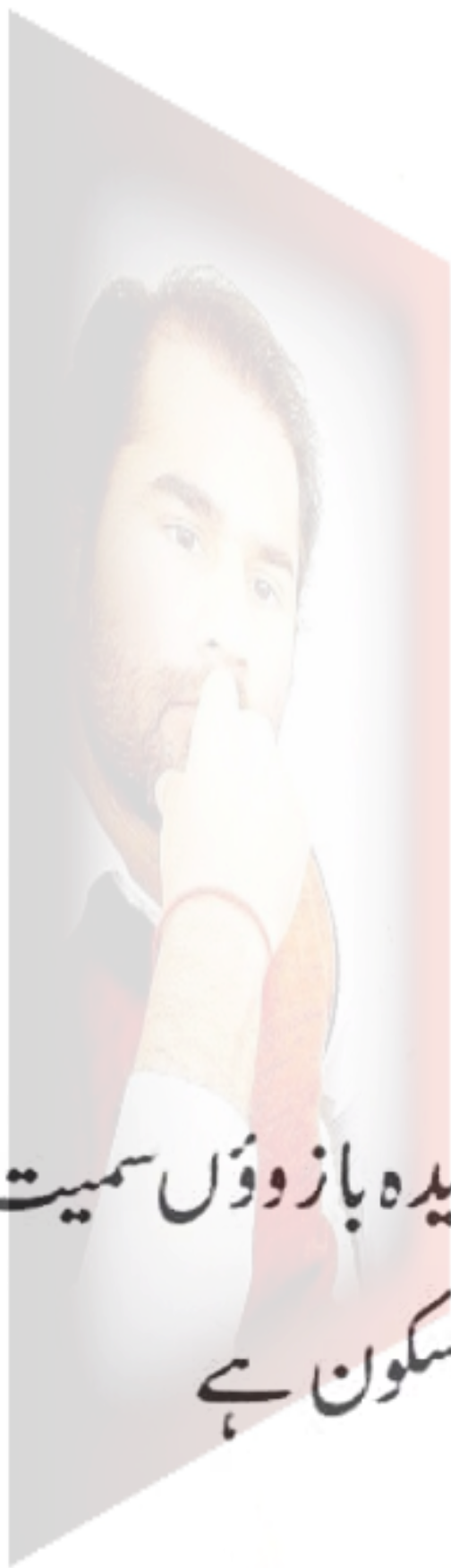
مصاحبینِ شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوؤں سمیت
شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے
فغانِ خلق اہلِ طائفہ کی نذر ہوگئی
متاعِ صبر وحشتِ دُعا کی نذر ہوگئی
اُمیدِ اجر بے یقینیِ جزا کی نذر ہوگئی
نہ اعتبارِ حرف ہے نہ آبروئے خون ہے
سکون ہی سکون ہے

مصاحبینِ شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوؤں سمیت
شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے
خلیجِ اقتدار سرکشوں سے پاٹ دی گئی
جو ہاتھ آئی دولتِ غنیم بانٹ دی گئی
طنابِ خیمۂ لسان و لفظ کاٹ دی گئی
فضا وہ ہے کہ آرزوئے خیر تک جنون ہے
سکون ہی سکون ہے
مصاحبینِ شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوؤں سمیت
شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے

قصّہ ایک بسنت کا

پتنگیں لوٹنے والوں کو کیا معلوم کس کے ہاتھ کا مانجھا کھرا تھا
اور کس کی ڈور ہلکی تھی
اُنھیں اس سے غرض کیا پیچ پڑتے وقت کن ہاتھوں میں لرزہ آ گیا تھا
اور کس کی کھینچ اچھی تھی؟
ہوا کس کی طرف تھی، کون سی پالی کی بیری تھی؟
پتنگیں لوٹنے والوں کو کیا معلوم —
اُنھیں تو بس بسنت آتے ہی اپنی اپنی ڈانگیں لے کے میدانوں میں آنا ہے
گلی کوچوں میں کانٹی مارنا ہے اور پتنگیں لوٹنا ہے، لوٹ کے جوہر دکھانا ہے
پتنگیں لوٹنے والوں کو کیا معلوم کس کے ہاتھ کا مانجھا کھرا تھا
اور کس کی ڈور ہلکی تھی؟

ایک رُخ

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں
گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندی ہوئی روشنی
دریا سے مقتل تک پھیلی ہوئی روشنی
جلے ہوئے خیموں میں سہمی ہوئی روشنی
سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں
ایسے ہر منظر کے بعد اک سناٹا چھا جاتا ہے

یہ سناٹا طبل و علم کی دہشت کو کھا جاتا ہے
سناٹا فریاد کی لے ہے احتجاج کا لہجہ ہے
یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے بہت پرانا قصہ ہے
ہر قصے میں صبر کے تیور ایک طرح کے ہوتے ہیں
وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں

خوف کے موسم میں لکھی گئی ایک نظم

وہ طائر جو کبھی اپنے پر و بال آزمانا چاہتے تھے
ہواؤں کے خدوخال آزمانا چاہتے تھے
آشیانوں کی طرف جاتے ہوئے ڈرنے لگے ہیں
کون جانے کون سا صیاد کیسی وضع کے جال آزمانا چاہتا ہو
کون سی شاخوں پہ کیسے گل کھلانا چاہتا ہو
شکاری اپنے باطن کی طرح اندھے شکاری،
حُرمتوں کے موسموں سے نابلد ہیں
اور نشانے مستند ہیں

جگمگاتی جاگتی شاخوں کو بے آواز رکھنا چاہتے ہیں
ستم گاری کے سب در باز رکھنا چاہتے ہیں
خداوندا! تجھے سہمے ہوئے باغوں کی سوگند
صداؤں کے ثمر کی منتظر شاخوں کی سوگند
اُڑانوں کے لیے پر تولنے والوں پر اک سایہ تحفظ کی ضمانت دینے والا
کوئی موسم بشارت دینے والا!

بارھواں کھلاڑی

خوش گوار موسم میں
اَن گنت تماشائی
اپنی اپنی ٹیموں کو
داد دینے آتے ہیں
اپنے اپنے پیاروں کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں
میں الگ تھلگ سب سے
بارھویں کھلاڑی کو
ہوٹ کرتا رہتا ہوں
بارھواں کھلاڑی بھی
کیا عجب کھلاڑی ہے

کھیل ہوتا رہتا ہے
شور مچتا رہتا ہے
داد پڑتی رہتی ہے
اور وہ الگ سب سے
انتظار کرتا ہے
ایک ایسی ساعت کا
ایک ایسے لمحے کا
جس میں سانحہ ہوجائے
پھر وہ کھیلنے نکلے
تالیوں کے جھرمٹ میں
ایک جملۂ خوش کن
ایک نعرۂ تحسین
اس کے نام پر ہوجائے
سب کھلاڑیوں کے ساتھ
وہ بھی معتبر ہوجائے
پر یہ کم ہی ہوتا ہے
پھر بھی لوگ کہتے ہیں
کھیل سے کھلاڑی کا

عمر بھر کا رشتہ ہے
عمر بھر کا یہ رشتہ
چھوٹ بھی تو سکتا ہے
آخری وِصل کے ساتھ
ڈوب جانے والا دِل
ٹوٹ بھی تو سکتا ہے
تم بھی اِفتخار عارف
بارھویں کھلاڑی ہو
انتظار کرتے ہو
ایک ایسے لمحے کا
ایک ایسی ساعت کا
جس میں حادثہ ہو جائے
جس میں سانحہ ہو جائے
تم بھی اِفتخار عارف
تم بھی ڈوب جاؤ گے
تم بھی ٹوٹ جاؤ گے

اِنتباہ

ہنڈولا جھولنے والے
زمیں سے کٹ کے اُونچا جھولنے کی چاہ رکھتے ہیں تو پھر جھولیں
مگر یہ یاد رکھیں!
زمیں سے کٹ کے اُونچا جھولنے والے فضاؤں میں معلّق ہی رہیں گے
جُھلانے والے کے رحم و کرم پر دائرہ در دائرہ گردش کریں گے
اور زمیں پر لوٹ کر بھی بے زمینی کے الم سہتے رہیں گے
ہنڈولا جھولنے والے
زمیں سے کٹ کے اُونچا جھولنے کی چاہ رکھتے ہیں
تو پھر جھولیں — مگر یہ یاد رکھیں —!

چک پھیری

بچپن کی گلیوں میں جن جن گھروں کے شیشے میری گیند سے ٹوٹے تھے
ان سب کی کرچیں کبھی کبھی میری آنکھوں میں چبھنے لگتی ہیں
جلتی دوپہروں میں میرے ہاتھوں اُجڑے ہوئے گھونسلوں کے بے حال پرندوں کی
چیخیں فریادیں میری بے گھر شاموں میں کہرام مچاتی رہتی ہیں
چکنا چور دنوں ریزہ ریزہ راتوں میں سوئے ہوئے سب خواب جگاتی رہتی ہیں
اپنے خنجر اپنے ہی سینے میں اُترنے لگتے ہیں
زندہ چہرے جلتے بجھتے لمحوں کی آغوش میں مرنے لگتے ہیں

ایک تھا راجا چھوٹا سا

علی افتخار کی ماں سے میں نے بتا دیا ہے کہ اپنے بیٹے کو
تتلیوں کے قریب جانے سے روکیے
اسے روکیے کہ پڑوسیوں کے گھروں میں جھولے پڑے ہوئے ہیں تو اس سے کیا
اسے کیا پڑی کہ کبوتروں کو بتائے کیسے ہوائیں اس کی پتنگ چھین کے لے گئیں
علی افتخار کی ماں سے میں نے بتا دیا ہے کہ اپنے بیٹے
کو تتلیوں کے قریب جانے سے روکیے
کہیں یوں نہ ہو کہ پھر ایک بار بھری بہار میں اعتبار کے سارے زخم مہک اُٹھیں
علی افتخار کی ماں سے میں نے بتا دیا ہے کہ اپنے بیٹے کو
تتلیوں کے قریب جانے سے روکیے
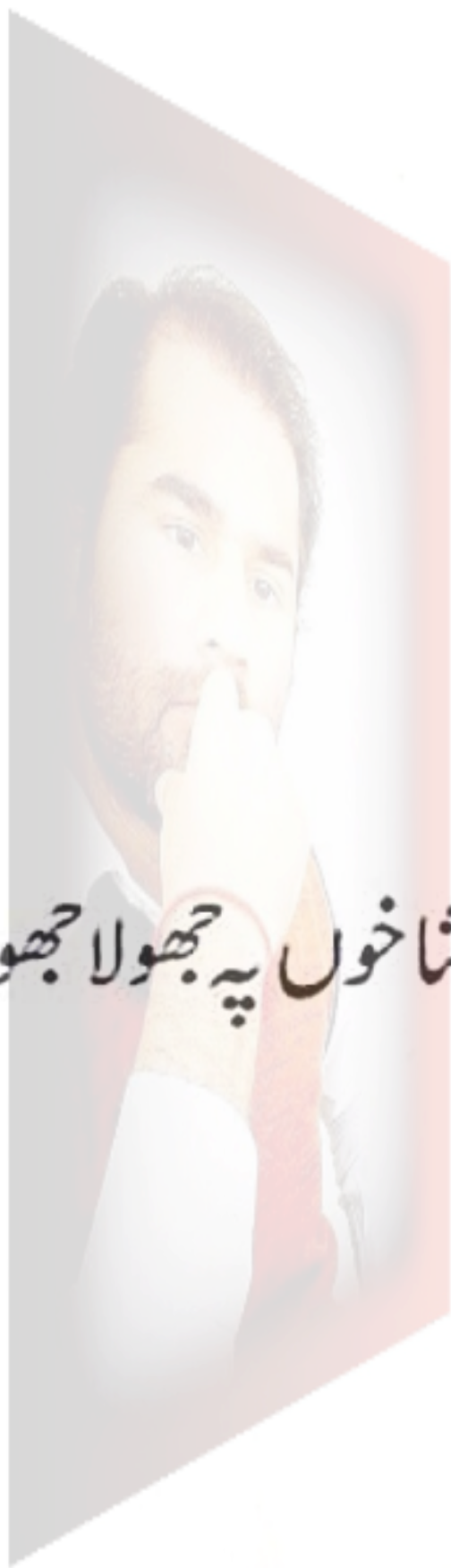
ہجرت

ہرے بھرے چھتنار درختوں کی اُونچی اُونچی شاخوں پہ جھولا جھولنے والا
اِک سرشار پرندہ
بجلی کے ننگے تاروں پر اُترا
اور نہال ہو گیا
بے سمجھے بوجھے اَن جانے رستوں پر جانے والوں کے بیچ
ایک کھلی مثال ہو گیا

پتا نہیں کیوں؟

پتا نہیں کیوں میں چاہتا ہوں کہ جب کبھی کوئی خواب دیکھوں
تو رات میری امانتیں مہربان سورج کو سونپ جائے
پتا نہیں کیوں میں چاہتا ہوں
پتا نہیں کیوں میں چاہتا ہوں کہ جب دُعاؤں کو ہاتھ اُٹھیں تو
کوئی میرے بلند ہاتھوں میں پھول رکھ دے
پتا نہیں کیوں میں چاہتا ہوں
پتا نہیں کیوں میں چاہتا ہوں کہ اب مرے عہد کے مقدر میں جتنے آنسو ہیں
میری آنکھوں میں جذب ہو جائیں اور ترکش میں تیر جتنے ہیں
میرے سینے میں ٹوٹ جائیں
پتا نہیں کیوں میں چاہتا ہوں —— !

احتجاج

...اور سنا ہے

ایک چمگادڑ چنبیلی کے مہکتے کنج میں دم توڑتی

دیکھی گئی ہے

سنا ہے خوشبوؤں میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا

اور ننھے پھول سورج بن کے اس کی بے یقین

آنکھوں میں اُترے جا رہے تھے

اُدھر بستی کے اک ویران اور سنسان قبرستان

میں چمگادڑوں کا ایک جلسہ ہو رہا ہے

ہر طرف سے ایک ہی آواز آئے جا رہی ہے

ایک ہی نعرہ سنائی دے رہا ہے

''سیہ راتوں کے پروردہ پرندوں کو چنبیلی کے مہکتے کنج

کا انعام ملنا چاہیے

ہر اک سورج کو رستے میں غبارِ شام ملنا چاہیے!''

ایک سوال
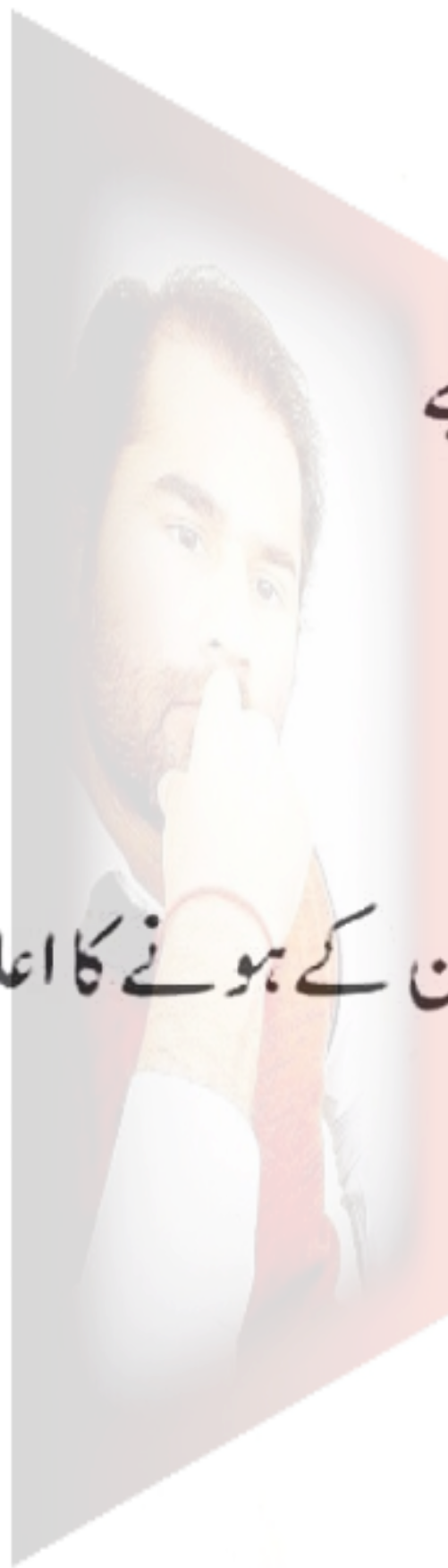
میرے آباؤاجداد نے حرمتِ آدمی کے لیے
تا ابد روشنی کے لیے
کلمۂ حق کہا
مقتلوں، قید خانوں، صلیبوں میں بہتا لہو ان کے ہونے کا اعلان کرتا رہا
وہ لہو حرمتِ آدمی کی ضمانت بنا
تا ابد روشنی کی علامت بنا
اور میں پا برہنہ سرِ کوچۂ احتیاج
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی
سوچتا رہ گیا
جسم میں میرے اُن کا لہو ہے تو پھر یہ لہو بولتا کیوں نہیں؟

ایک اُداس شام کے نام

عجیب لوگ ہیں
ہم اہلِ اعتبار کتنے بدنصیب لوگ ہیں
جو رات جاگنے کی تھی وہ ساری رات
خواب دیکھ دیکھ کر گزارتے رہے
جو نام بھولنے کا تھا اُس ایک نام کو
گلی گلی پکارتے رہے
جو کھیل جیتنے کا تھا وہ کھیل ہارتے رہے
عجیب لوگ ہیں
ہم اہلِ اعتبار کتنے بدنصیب لوگ ہیں
کسی سے بھی تو قرضِ آبرو ادا نہیں ہوا

لہولہان ساعتوں کا فیصلہ نہیں ہوا

برس گزر گئے ہیں کوئی معجزہ نہیں ہوا

وہ جل بجھا کہ آگ جس کے شعلۂ نفس میں تھی

وہ تیر کھا گیا کمان جس کی دسترس میں تھی

سیاہِ مہر کا فصیلِ شب کو انتظار ہے

کب آئے گا وہ شخص جس کا سب کو انتظار ہے

ہم اہلِ انتظار کتنے بدنصیب لوگ ہیں

عجیب لوگ ہیں

ہم اہلِ اعتبار کتنے بدنصیب لوگ ہیں

پرانے دشمن

اک سورج ہے جو شام ڈھلے مجھے پرسا دینے آتا ہے

ان پھولوں کا جو میرے لہو میں کھلنے تھے اور کھلے نہیں

ان لوگوں کا جو کسی موڑ پہ ملنے تھے اور ملے نہیں

اک خوشبو ہے جو بستی بستی میرا پیچھا کرتی ہے

اور اپنے جی کی بات بتاتے ڈرتی ہے

اک دریا ہے جو جنم جنم کی پیاس بجھانے آتا ہے

اور انگارے برساتا ہے

اور یہ سورج اور یہ خوشبو اور یہ دریا

مری آن بان کے بیری ہیں

سب میری جان کے بیری ہیں

سرگوشی

تمھیں کیا ہو گیا ہے

بتاؤ تو سہی اے جانِ جاں! جانانِ جاں!

آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے

اپنی ہی آواز سے ڈرنے لگے ہو، اپنے ہی سائے سے گھبرانے لگے ہو

اپنے ہی چہرے سے شرمانے لگے ہو

بتاؤ تو سہی — آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے

چلو ہم نے یہ مانا یہ زمانہ اب ہمارے اور تمھارے بس سے

باہر ہو گیا ہے

ان دنوں میں بے حسی کے موسموں میں دل کا خوں ہونا

مقدر ہو گیا ہے

مگر اُس قہرماں بستی میں دو آنکھیں تو ایسی ہیں کہ جن میں

کوئی اندیشہ نہیں ہے اور جن کے خواب یکساں ہیں

بہت مبہم سی اک تعبیر کا امکان تو ہے

یہ شب گزرے نہ گزرے صبح پر ایمان تو ہے

تو پھر اے جانِ جاں ویران کیوں ہو

اس قدر شاداب آنکھیں جب دُعا گو ہیں

تو اتنے بے سر و سامان کیوں ہو

بتاؤ تو سہی اے جانِ جاں آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے

اپنی ہی آواز سے ڈرنے لگے ہو

اپنے ہی چہرے سے شرمانے لگے ہو

اپنے ہی سائے سے گھبرانے لگے ہو!
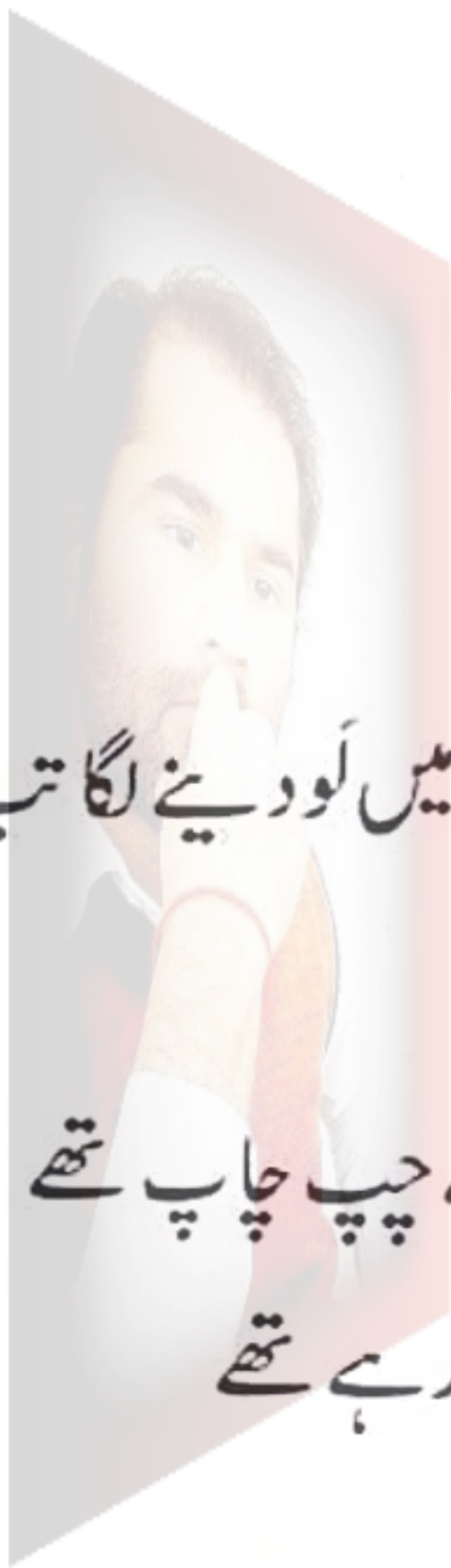
ٹیمز کے ساحل پر

ٹیمز کے ساحل پہ اِک چہرہ مری آنکھوں میں لَو دینے لگا تب میں نے دیکھا
اپنے مٹیالے سمندر کے کنارے
ایک ایسی ہی سلونی شام تھی ہم ساتھ تھے چپ چاپ تھے
اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کچھ کہہ رہے تھے
جانے کیا کچھ کہہ رہے تھے
ایسا لگتا تھا کہ سارے انفس و آفاق ہم پر مہرباں ہونے کو ہیں
ہم جاوداں ہونے کو ہیں
اُس گھڑی یہ کون کہہ سکتا تھا ہم خوابوں کی تعبیروں کے بجرے
کون سے ساحل پہ ہوں گے
دھوپ جب پیڑوں سے اُترے گی تو کس منزل پہ ہوں گے

اور اب اتنے برس کا فاصلہ ہے
وہ بھی اپنے حال کی آئینہ داری میں مگن ہے
بندھنوں کے سحر میں کھویا ہوا ہے
اور ادھر بھی ٹیمز کے ساحل پہ اک چہرہ مری آنکھوں میں لَو دینے لگا ہے

ہوائیں اَن پڑھ ہیں

اب کے بار پھر
موجِ بہار نے
فرشِ سبز پر
ساعتِ مہر میں،
ہارسنگھار سے
ہم دونوں کے نام لکھے ہیں
اور دُعا مانگی ہے کہ ''اے راتوں کو جگنو دینے والے!
سوکھی ہوئی مٹی کو خوشبو دینے والے!
شکرگزار آنکھوں کو آنسو دینے والے!
ان دونوں کا ساتھ نہ چھوٹے''

اور سنا یہ ہے کہ ہوائیں
اب کے بار بھی تیز بہت ہیں
شہرِ وصال سے آنے والے موسم ہجر انگیز بہت ہیں

سوغات

گلدانوں میں سجے ہوئے پھولوں کو میں نے
رات اپنی آغوش میں لے کر اتنا بھینچا
سارے رنگ اور ساری خوشبو انگ انگ
میں بسی ہوئی ہے
ساری دُنیا نئی ہوئی ہے
پر مجھ کو اُن سب رنگوں اور خوشبوؤں سے ڈر لگتا ہے
جن کا مقدر تنہائی ہو
یا پھر ایسی رُسوائی ہو جس کی آگ میں برس برس کے
سجے ہوئے منظر جل جائیں
گھر جل جائیں
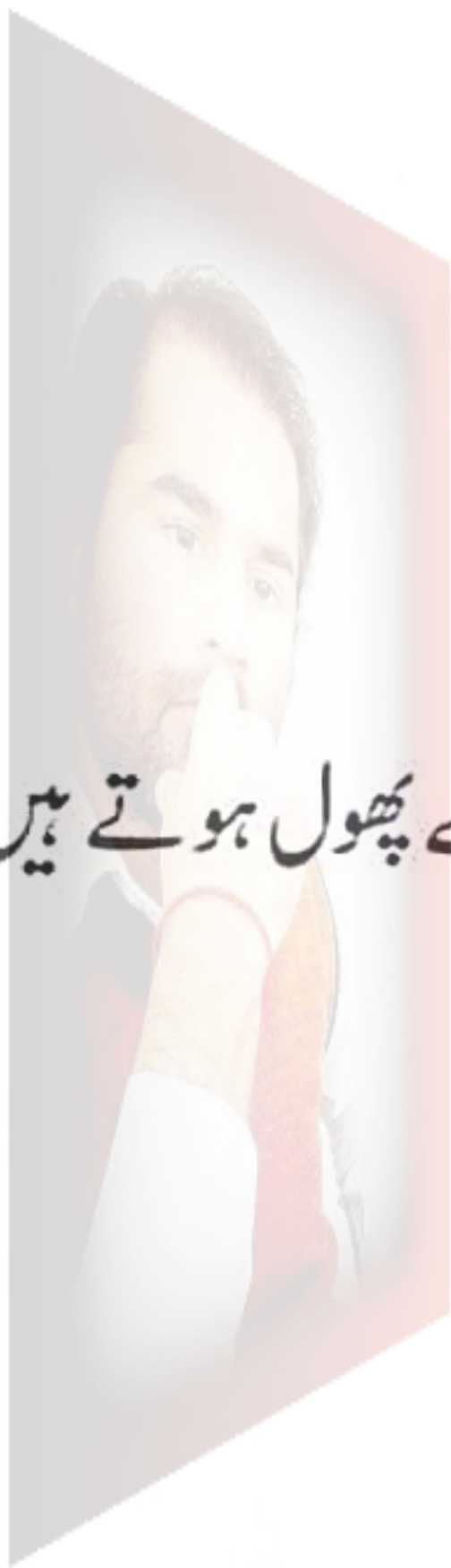
تجاہلِ عارفانہ

جوہری کو کیا معلوم کس طرح کی مٹی میں کیسے پھول ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں
کیسی باس ہوتی ہے
جوہری کو کیا معلوم
جوہری تو ساری عمر پتھروں میں رہتا ہے
زرگروں میں رہتا ہے
جوہری کو کیا معلوم
یہ تو بس وہی جانے
جس نے اپنی مٹی سے
اپنا ایک اک پیماں

استوار رکھا ہو

جس نے حرفِ پیماں کا اعتبار رکھا ہو

جوہری کو کیا معلوم کس طرح کی مٹی میں کیسے پھول ہوتے ہیں

کس طرح کے پھولوں میں کیسی باس ہوتی ہے

دُعا

مالک! میری گڑیا کے سب رنگ سلامت رکھنا، مجھ کو ڈر لگتا ہے
کچے رنگ تو بارش کی ہلکی سی پھوار میں بہہ جاتے ہیں
ایک ذرا سی دُھوپ پڑے تو اُڑ جاتے ہیں
مالک! میری گڑیا کے سب رنگ سلامت رکھنا، مجھ کو ڈر لگتا ہے

ایک کہانی بڑی پرانی

رات ویران تھی

اور چاند اپنی تاروں بھری انجمن اپنے ہاتھوں سے تاراج کرتا ہوا

بحر کی بے نشاں منزلوں کے سفر پر روانہ ہوا

شاخِ گل چاند کا راستہ دیکھتے دیکھتے رو پڑی

صبح دَم مہرباں آسمانوں سے کرنوں کی بارش ہوئی

شاخِ گل مسکرانے لگی

اپنی تنہائی کے سارے غم بھول کر گنگنانے لگی

مہرباں آسمانوں کی کرنیں بکھرتی رہیں پھر سمٹنے لگیں

نور کے قافلے اپنی پرچھائیوں سے ہم آغوش ہو کر کسی اور بستی کی قسمت جگانے چلے

اور میں ہنس پڑا

ہنس پڑا میں کہ پھر شام کی اوٹ میں چاند کے قافلے کا غبار آئنہ بن چکا تھا

اپنے ایک دوست کے نام

میں منافق ہوں مگر دُنیا بہت سچی ہے
اپنی ماں کو ماں کہنے سے کتراتی ہے
اپنے خون کی آواز کا اِنکار کرتی ہے محبت کے ہر اک رشتے کو جھٹلاتی ہے
میں تنہا منافق ہوں مگر دُنیا بہت سچی ہے
سدھے بندر کی صورت ڈگڈگی تھامے مداری کے کہے پر نت نئے کرتب دکھاتی ہے
اور اپنے لقمۂ تر کے لیے خارش زدہ کتّوں کے تلوے چاٹتی ہے
اور یہ دُنیا بہت سچی ہے
میں تنہا منافق ہوں!

ابوالہول کے بیٹے

چھوٹے چھوٹے فرعونوں کا اک لشکر اور ایک اکیلا میں

مرے ہاتھ عصا سے خالی

ہاتھ عصا سے خالی ہوں تو ہستی دوبھر ہو جاتی ہے

ہوا مخالف ہو جائے تو لہر سمندر ہو جاتی ہے

موت مقدر ہو جاتی ہے

چھوٹے چھوٹے فرعونوں کا اک لشکر اور ایک اکیلا میں

مرے ہاتھ عصا سے خالی!

جھوٹ

ہمارے اِس جہان میں
سنا ہے ایسے لوگ ہیں کہ جن کی زندگی کے دن
کھلے ہوئے گلاب ہیں
سجے ہوئے چراغ ہیں
گلاب ! جن کی نکہتوں کے قافلے رواں دواں
چراغ! چار سو بکھیرتے ہوئے تجلّیاں
سنا ہے ایسے لوگ ہیں ہمارے اِس جہان میں
خدا کرے کہ ہوں مگر
نہ جانے کیوں مجھے یہ لگ رہا ہے جیسے جھوٹ ہے

لذّتِ آوارگی

ہوائیں فاحشہ ہیں
سر پھری پاگل ہوائیں فاحشہ ہیں
آرزوئے وصل میں قریہ بہ قریہ گھومتی ہیں
برگ و گُل سے کھیلتی ہیں، نسبتِ وارفتگی کی سرخوشی میں جھومتی ہیں
اور فضائیں زرد پڑ جائیں تو پھر یہ بھی بگولوں کے لباسِ گرد میں
سارے خس و خاشاکِ شہرِ بے نمو کو چومتی ہیں
ہوائیں فاحشہ ہیں
سر پھری پاگل ہوائیں فاحشہ ہیں

اِستغاثہ

تو کیا کوئی معجزہ نہ ہوگا؟
ہمارے سب خواب وقت کی بے لحاظ آندھی میں جل بجھیں گے
دو نیم دریا و چاہِ تاریک و آتشِ سرد و جاں نوازی کے سلسلے ختم ہو گئے کیا؟
تو کیا کوئی معجزہ نہ ہوگا؟
خدائے زندہ! یہ تیری سجدہ گزار بستی کے سب مکینوں کی التجا ہے
کوئی تو ایسی سبیل نکلے کہ تجھ سے منسوب گُل زمینوں کی عظمتیں پھر سے لوٹ آئیں
وہ عفو کی، درگزر کی، مہر و وفا کی بھولی روایتیں پھر سے لوٹ آئیں
وہ چاہتیں — وہ رفاقتیں — وہ محبتیں پھر سے لوٹ آئیں

اسکینڈل

اب کے جب آئے تو اس طرح سے آئے مرا دوست
جس طرح شام کے اخبار میں خبریں آئیں

شہر کا شہر سنبھالے ہوئے پتھّر نکلے
ہر نئے جرم کا الزام مرے سر نکلے

اور پھر جُرمِ محبت کی پذیرائی ہو
جشن کا جشن ہو رُسوائی کی رُسوائی ہو

اُس نے کہا تھا

اُس نے کہا تھا:
''تم وہ شجر ہو
جس کی شاخیں تپتی دُھوپ میں شبنم شبنم سایہ پھیل رہی ہیں
جیسے ذات کی پہنائی ہو!''
اُس نے کہا تھا:
''تم وہ شجر ہو جس کے پتّوں کی شادابی سوندھی خوشبو
موسم گُل کا سرمایہ ہے
جیسے خواب کی رعنائی ہو
تم وہ شجر ہو جس کی جڑیں اتنی گہری ہیں
جیسے رُوح کی گہرائی ہو!''

اُس نے کہا تھا —

یہ تو گئے دِن کی باتیں ہیں

پت جھڑ سے پہلے کی باتیں

اب تو زیست کی ایک اِک ساعت ایک اِک لمحہ

دشتِ جنوں میں تنہائی کا بوجھ اُٹھائے

آنے والے رہگیروں سے پوچھ رہا ہے

یہ موسم کب تک بدلے گا؟

کب تک یہ موسم بدلے گا —؟

سُورت کا کافی ہاؤس☆

جانے کیا ہے بہت دنوں سے آنکھیں ایسے منظر پر اصرار کیے جاتی ہیں
جسے دیکھ کر بینائی کا رُخصت ہوجانا لازم ہے
دِل تو خیر ہمیشہ ہی آنکھوں کے کہے میں آجاتا ہے
لیکن اب کے اس کے دعوے اس کی دلیلیں اور طرح کی
اس کی پیاس اور اس کی سبیلیں اور طرح کی
وہ بھی کیسا منظر ہوگا جس کی قیمت بینائی ہے
ایسا منظر دیکھ کے اندھا ہوجانے میں دانائی ہے

☆ ٹالسٹائی کی مشہور کہانی

تکمیل

کوئی بتائے سرشت اور نفسِ مطمئنہ کے درمیاں کتنا فاصلہ ہے
گناہ کی لذتِ سکوں بخش
منتہائے سرشتِ آدم
تو نان اور جنس کے تعاقب میں ساری گردش ثواب ٹھہری
سرشتِ آدم گناہ ٹھہری
گناہ تخلیق کا ثمر ہے
یہ وہ شجر ہے کہ جس کے سائے میں مطمئن نفس اپنے پیکر کو از سرِ نو تراشتا ہے

صحرا میں ایک شام

دشتِ بے نخیل میں
بادِ بے لحاظ نے
ایسی خاک اُڑائی ہے
کچھ بھی سوجھتا نہیں
حوصلوں کا سائباں
راستوں کے درمیاں
کس طرح اُجڑ گیا
کون کب بچھڑ گیا
کوئی پوچھتا نہیں
فصلِ اعتبار میں

آتشِ غبار سے
خیمۂ دُعا جلا
دامنِ وفا جلا
کس بُری طرح جلا
پھر بھی زندگی کا ساتھ ہے کہ چھوٹتا نہیں
کچھ بھی سوجھتا نہیں
کوئی پوچھتا نہیں
اور زندگی کا ساتھ ہے کہ چھوٹتا نہیں

ھل من ناصراً ینصرنا

یہ زمینوں آسمانوں کے عذاب اور میں اکیلا آدمی

میں اکیلا آدمی کب تک لڑوں

سارے دُشمن درپے آزار، لشکر صف بہ صف

لشکروں کے سب کمانداروں کے رُخ میری طرف

اور میں نہتّا آدمی

میں نہتّا آدمی کب تک لڑوں

میں اکیلا آدمی کیسے لڑوں

نروان

جسم کے راستوں سے گزر کر
مطمئن نفس کی آرزو میں
جو بھی نکلا وہ واپس نہ آیا
رُوح کی وحشتوں میں اُلجھ کر
مطمئن نفس کی آرزو میں
جو بھی نکلا وہ واپس نہ آیا
لوگ پھر دیکھتے کیوں نہیں ہیں
لوگ پھر سوچتے کیوں نہیں ہیں
لوگ پھر بولتے کیوں نہیں ہیں

ایک پَل کا فاصلہ

ایک پَل کا فاصلہ ہے
عشق اور آوارگی کے درمیاں بس ایک پَل کا فاصلہ ہے
ایک پَل کا فاصلہ ہے
شاخِ گل پر شبنمِ وارفتہ کا پیہم نزول!
حرفِ پیماں درمیانِ جسم و جاں!
منزلِ دستِ دُعا بابِ قبول!
ایک پل کا فاصلہ ہے
عشق اور آوارگی کے درمیاں بس ایک پل کا فاصلہ ہے۔

اِلتجا

مرے شکاریو! امان چاہتا ہوں میں

بس اب سلامتیِ جاں کی حد تلک اُڑان چاہتا ہوں میں

مرے شکاریو! امان چاہتا ہوں میں

میں ایک بار پہلے بھی ہرے بھرے دنوں کی آرزو میں زیرِ دام آ چکا ہوں

مجھ کو بخش دو

میں اس سے پہلے بھی تو سایۂ شجر کی جستجو میں اتنے زخم کھا چکا ہوں

مجھ کو بخش دو

مرے شکاریو! امان چاہتا ہوں میں

بس اب سلامتیِ جاں کی حد تلک اُڑان چاہتا ہوں میں

بس ایک گھر زمین و آسماں کے درمیان چاہتا ہوں میں

مرے شکاریو! امان چاہتا ہوں میں

ایک نابینا بستی کے نام

بستی کی سب گلیوں اور بازاروں اوز چوباروں میں
ایک نعرہ گونج رہا ہے
''سورج کو رہا کرو''
''سورج کو رہا کرو''
سورج کی آزادی مانگنے والے کیا بالکل اندھے ہیں!

دُعا

یہ جبرِ ماہ و سال میں گھری ہوئی زمیں مری گواہ ہے
نشاط کی ابد کنار منزلوں میں ایک عمر سے میں ان کریم اور جمیل ساعتوں کا منتظر ہوں
جن کی بازگشت سے مرے وجود کی صداقتوں کا انکشاف ہو
خدا کرے بشارتیں سنانے والے خوش کلام طائروں کی ٹولیاں
افق سے شاخِ گُل تلک علامتِ وصال کی لکیریں کھینچ دیں
لہو کی وسعتوں کا انکشاف ہو
لہو کی عظمتوں کا انکشاف ہو
بدن کے راستے وجود کی صداقتوں کا انکشاف ہو!

بیلنس شیٹ

کسے خبر تھی
ایک مسافر مستقبل زنجیر کرے گا اور سفر کے سب آداب بدل جائیں گے
کسے یقیں تھا
وقت کی رَو جس دِن مٹھی میں بند ہوگئی ساری آنکھیں سارے خواب بدل جائیں گے
ہمیں خبر تھی
ہمیں یقیں تھا
تبھی تو ہم نے توڑ دیا تھا رشتۂ شہرتِ عام
تبھی تو ہم نے چھوڑ دیا تھا شہرِ نمود و نام
لیکن اب مرے اندر کا کم زور آدمی شام سویرے مجھے ڈرانے آجاتا ہے
نئے سفر میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے، سب سمجھانے آجاتا ہے!

اعلان نامہ

میں لاکھ بزدل سہی مگر میں اُسی قبیلے کا آدمی ہوں کہ جس کے بیٹوں نے
جو کہا اُس پہ جان دے دی
میں جانتا تھا مرے قبیلے کی خیمہ گاہیں جلائی جائیں گی اور تماشائی
رقصِ شعلہ فشاں پر اصرار ہی کریں گے
میں جانتا تھا مرا قبیلہ بریدہ اور بے رِدا سروں کی گواہیاں
لے کے آئے گا پھر بھی لوگ انکار ہی کریں گے
سو میں کمیں گاہِ عافیت میں چلا گیا تھا
سو میں اماں گاہِ مصلحت میں چلا گیا تھا
اور اَب مجھے میرے شہسواروں کا خون آواز دے رہا ہے
تو نذرِ سر لے کے آ گیا ہوں
تباہ ہونے کو ایک گھر لے کے آ گیا ہوں
میں لاکھ بُزدل سہی مگر میں اُسی قبیلے کا آدمی ہوں!

اور ہوا چپ رہی

شاخِ زیتون پر کم سخن فاختاؤں کے اتنے بسیرے اُجاڑے گئے
اور ہوا چپ رہی
بے کراں آسمانوں کی پہنائیاں بے نشیمن شکستہ پروں کے تگ وتاز پر بین کرتی رہیں
اور ہوا چپ رہی
زرد پرچم اُڑاتا ہوا لشکرِ بے اماں گل زمینوں کو پامال کرتا رہا
اور ہوا چپ رہی
آرزومند آنکھیں، بشارت طلب دل، دعاؤں کو اُٹھے ہوئے ہاتھ سب بے ثمر رہ گئے
اور ہوا چپ رہی
اور تب حبس کے قہرماں موسموں کے عذاب ان زمینوں پہ بھیجے گئے
اور مُنادی کرادی گئی
جب کبھی رنگ کی خوشبوؤں کی اُڑانوں کی آواز کی اور خوابوں کی توہین کی جائے گی
یہ عذاب اِن زمینوں پہ آتے رہیں گے

سراب

تھکے ہوئے آسمان کے مضمحل ستارے
جوان راتوں کے ہم نصیبوں سے کہہ رہے ہیں
وفورِ وارفتگی کے صحرا میں
نور کی ندیوں کا دیوانہ پن بھی کب تک
لہو کی یہ انجمن بھی کب تک
بدن کی بیساکھیوں سے تنہائیوں کے
یہ سنگلاخ رستے
گزر سکیں تو گزار لو پھر بدن بھی کب تک

پس نوشت

خداوندا! مجھے توفیق دے میں ایسے زندہ لفظ لکھوں

جو نہ لکھوں میں تو دُنیا بانجھ ہو جائے

مگر پھر سوچتا ہوں اتنے زندہ لفظ لکھے جا چکے ہیں

اور لکھے جا رہے ہیں

میں بھی لکھ لوں گا تو کیا ہو جائے گا

کیا یہ پرانا آدمی پھر سے نیا ہو جائے گا

یا دوسرا ہو جائے گا!؟

شہرِ نوروز میں بہار کا پہلا دن

گلِ نیلمیں!

تجھے دیکھتا ہوں تو پہلے میرا وجود، محوِ درود و سر بسجود ہوتا ہے

تیرے حسن کی طرفگی و جمال پر

ترے رنگ تازہ و تہ بہ تہ کے کمال پر

پھر اُداس ہوتا ہوں دیکھ کر

وہ جو ایک خطِ ملال ہے

ترے رنگ سے مرے خواب تک

کہیں خوشبوؤں میں بسا ہوا

کہیں آنسوؤں میں گندھا ہوا

گلِ نیلمیں!

تجھے کچھ خبر بھی ہے انتظار کی گرد، موسمِ سرخرو کو سیاہ کر کے گزر رہی ہے

عذابِ خواب کی وحشتوں پہ روش روش کو گواہ کر کے گزر رہی ہے

سوادِ جاں میں نوا و نغمہ و نقش و رنگ کی ساری فصل تباہ کر کے گزر رہی ہے

گلِ نیلمیں! مری چشمِ خواب کا انتساب الم سے ہے

تری شاخِ سبز کی آبرو ترے دم سے ہے

ترے رنگ تیرا صلہ ہوئے

مرے خواب میری سزا ہوئے

سو یونہی سہی کہ بھری بہار کے پہلے دن کے طلوع سے

شبِ خوابِ رفتہ کے انہدام کی صبح تک

تری شاخ شاخ ہری رہے

مری آنکھ خوں سے بھری رہے

ابھی کچھ دن لگیں گے

ابھی کچھ دن لگیں گے

دل ایسے شہر کے پامال ہو جانے کا منظر بھولنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے
جہانِ رنگ کے سارے خس و خاشاک
سب سرو و صنوبر بھولنے میں، ابھی کچھ دن لگیں گے
تھکے ہارے ہوئے خوابوں کے ساحل پر، کہیں امید کا چھوٹا سا اک گھر
بنتے بنتے رہ گیا ہے
وہ اک گھر بھولنے میں، ابھی کچھ دن لگیں گے
مگر اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں

بس اک دن دل کی لوحِ منتظر پر

اچانک

رات اُترے گی

مری بے نور آنکھوں کے خزانے میں چھپے ہر خواب کی تکمیل کر دے گی

مجھے بھی خواب میں تبدیل کر دے گی

اک ایسا خواب جس کا دیکھنا ممکن نہیں تھا

اک ایسا خواب جس کے دامنِ صد چاک میں کوئی مبارک، کوئی روشن دن نہیں تھا

ابھی کچھ دن لگیں گے!

بدشگونی

عجب گھڑی تھی
کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی
چمکتے لفظوں کی میلی آنکھوں میں اُلجھے آنسو بلا رہے تھے
مگر مجھے ہوش ہی کہاں تھا
نظر میں اک اور ہی جہاں تھا
نئے نئے منظروں کی خواہش میں اپنے منظر سے کٹ گیا ہوں
نئے نئے دائروں کی گردش میں اپنے محور سے ہٹ گیا ہوں
صلہ، جزا، خوف، نا امیدی
اُمید، امکان، بے یقینی
ہزار خانوں میں بٹ گیا ہوں

اب اس سے پہلے کہ رات اپنی کمند ڈالے یہ چاہتا ہوں کہ لوٹ جاؤں

عجب نہیں وہ کتاب اب بھی وہیں پڑی ہو

عجب نہیں آج بھی مری راہ دیکھتی ہو

چمکتے لفظوں کی میلی آنکھوں میں اُلجھے آنسو

ہوا و حرص و ہوس کی سب گرد صاف کردیں

عجب نہیں میرے لفظ مجھ کو معاف کردیں

عجب گھڑی تھی

کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی

ایک خواب کی ڈوری پر

اک خواہش تھی
کبھی ایسا ہو
کبھی ایسا ہو کہ اندھیرے میں
(جب دل وحشت کرتا ہو بہت
جب غم شدت کرتا ہو بہت)
کوئی تیر چلے،
کوئی تیر چلے جو ترازو ہو مرے سینے میں
اک خواہش تھی
کبھی ایسا ہو
کبھی ایسا ہو کہ اندھیرے میں

(جب نیندیں کم ہوتی ہوں، بہت

جب آنکھیں نم ہوتی ہوں بہت)

سرِ آئینہ کوئی شمع جلے

کوئی شمع جلے اور بجھ جائے مگر عکس رہے آئینے میں

اک خواہش تھی

وہ خواہش پوری ہو بھی چکی

دل جیسے دیرینہ دشمن کی سازش پوری ہو بھی چکی

اور اب یوں ہے

جینے اور جیتے رہنے کے بیچ ایک خواب کی

دُوری ہے

وہ دُوری ختم نہیں ہوتی

اور یہ دُوری سب خواب دیکھنے والوں کی مجبوری ہے

مجبوری ختم نہیں ہوتی

مرا ذہن مجھ کو رہا کرے

مرا ذہن دل کا رفیق ہے

مرا دل رفیق ہے جسم کا

مرا جسم ہے مری آنکھ میں

مری آنکھ اس کے بدن میں ہے

وہ بدن کہ بوسۂ آتشیں میں جلا بھی پھر بھی ہرا رہا

وہ بدن کہ لمس کی بارشوں میں دُھلا بھی پھر بھی نیا رہا

وہ بدن کہ وصل کے فاصلے پہ رہا بھی پھر بھی مرا رہا

مجھے اعتراف! مرے وجود پہ ایک چراغ کا ایک خواب کا ایک امید کا قرض ہے

مجھے اعتراف! کہ میرے ناخنِ بے ہنر پہ ہزار طرح کے قرض ہیں

مرا ذہن مجھ کو رہا کرے تو میں سارے قرض اُتار دوں

مری آنکھ مجھ سے وفا کرے تو میں جسم جان پہ وار دوں

اے وائے بر حرفِ ہنر

سورج سوا نیزے پہ اور نیزہ مرے سینے کے پار

اور ہر طرف زندہ لہو کی آگ میں جھلسے ہوئے، جلتے ہوئے لفظوں کے بیچ

اک نسخۂ ''مہرِ دو نیم''

اور اک بھیانک چیخ، پھر اک قہقہہ

پھر ایک آوازِ فغاں

''اے وائے بر مہرِ دو نیم!!

اے وائے بر حرفِ دو نیم!!''

اے خالقِ آہنگ و رنگ و نغمہ و صوت و صدا

تیرے مغنّی، تیرے صورت گر، تیرے حرف آشنا

لوحِ ابد پر اپنی مہرِ سرفرازی ثبت کرنے کے جنوں میں سرنگوں

خوار و زبوں بے آسرا، بے دست و پا
اے مالکِ آہنگ و رنگ و نغمہ! یہ تیری جزا بھی خوب ہے
یہ منصبِ کارِ امانت کا صلہ بھی خوب ہے
اک شاعرِ وارفتہ کے شوقِ فراواں کی سزا بھی خوب ہے

خوں بہا

اپنے شہسواروں کو
قتل کرنے والوں سے
خوں بہا طلب کرنا
وارثوں پہ واجب تھا
قاتلوں پہ واجب تھا
خوں بہا ادا کرنا
واجبات کی تکمیل
منصفوں پہ واجب تھی
(منصفوں کی نگرانی
قدسیوں پہ واجب تھی)

وقت کی عدالت میں

ایک سمت مسند تھی

ایک سمت خنجر تھا

تاجِ زرنگار اک سمت

ایک سمت لشکر تھا

اک طرف مقدر تھا

طائفے پکار اٹھے

''تاج و تخت زندہ باد!

ساز و رخت زندہ باد!''

خلق ہم سے کہتی ہے، سارا ماجرا لکھیں

کس نے کس طرح پایا اپنا خوں بہا، لکھیں

چشمِ نم سے شرمندہ،

ہم قلم سے شرمندہ سوچتے ہیں کیا لکھیں!
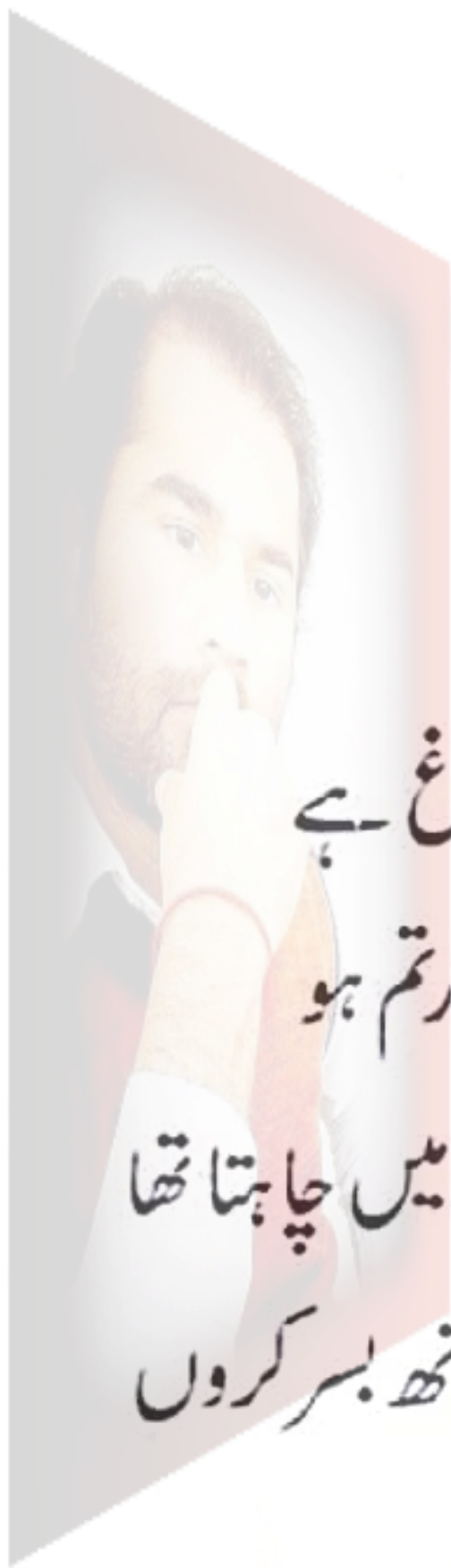
محبّت کی ایک نظم

مری زندگی میں بس اک کتاب ہے اک چراغ ہے
ایک خواب ہے اور تم ہو
یہ کتاب و خواب کے درمیان جو منزلیں ہیں، میں چاہتا تھا
تمھارے ساتھ بسر کروں
یہی کل اثاثۂ زندگی ہے اسی کو زادِ سفر کروں
کسی اَور سمت نظر کروں تو مری دُعا میں اثر نہ ہو
مرے دل کے جادۂ خوش خبر پہ بجز تمھارے کبھی کسی کا گزر نہ ہو
مگر اِس طرح کہ تمھیں بھی اس کی خبر نہ ہو
اسی احتیاط میں ساری عمر گزر گئی
وہ جو آرزو تھی کتاب و خواب کے ساتھ تم بھی شریک ہو، وہی مر گئی

اسی کشمکش نے کئی سوال اٹھائے ہیں

وہ سوال جن کا جواب میری کتاب میں ہے نہ خواب میں

مرے دل کے جادۂ خوش خبر کے رفیق

تم ہی بتاؤ پھر کہ یہ کاروبارِ حیات کس کے حساب میں

مری زندگی میں بس اک کتاب ہے اک چراغ ہے

ایک خواب ہے اور تم ہو!

بدن دریدہ روحوں کے نام ایک نظم

خوابوں سے تہی بے نور آنکھیں
ہر شام نئے منظر چاہیں
بے چین بدن، پیاسی روحیں
ہر آن نئے پیکر چاہیں
بے باک لہو
ان دیکھے سپنوں کی خاطر
جانے اَن جانے رستوں پر
کچھ نقش بنانا چاہتا ہے
بنجر، پامال، زمینوں میں
کچھ پھول کھلانا چاہتا ہے

یوں نقش کہاں بن پاتے ہیں
یوں پھول کہاں کھلنے والے
ان بدن دریدہ روحوں کے
یوں چاک کہاں سلنے والے
بے باک لہو کو حرمت کے آداب سکھانے پڑتے ہیں
تب مٹی موج میں آتی ہے
تب خواب کے معنی بنتے ہیں
تب خوشبو رنگ دِکھاتی ہے

گم نام سپاہی کی قبر پر

سپاہی! آج بھی کوئی نہیں آیا
کسی نے پھول ہی بھیجے
نہ بستی کے گھروں سے آشنا گیتوں کی آوازیں سنائی دیں
نہ پرچم کوئی لہرایا
سپاہی! شام ہونے آئی اور کوئی نہیں آیا
فنا کی خندقوں کو جان دے کر پار کر جانا بڑی بات
جہاں جینے کی خاطر مر رہے ہوں لوگ، اُس بستی میں مر جانا بڑی بات
مگر پل بھر کو یہ سوچا تو ہوتا
تمھارے بعد گھر کی منتظر دہلیز کو جاگے ہوئے دل کی نشانی کون دے گا
ہواؤں سے اُلجھتی، روشنی کو اعتبارِ کامرانی کون دے گا
در و دیوار سے لپٹی ہوئی بیلوں کو پانی کون دے گا!؟

شکست

زمینِ سنگ سے سورج اُگانے والے ہاتھ
کسے خبر تھی کہ اُس شہر میں قلم ہوں گے
جہاں سے پرچمِ دستِ ہنر بلند ہوا
زمیں عقیدۂ فردا سے لالہ رنگ ہوئی
افق ستارۂ محنت سے ارجمند ہوا
اور اب کے بار قلم بھی انھی کے ساتھ رہے
جو اپنی فتح کے نشے میں چور نخوت سے
دریدہ دامنیِ اہلِ دل پہ ہنستے ہیں
فغانِ قافلۂ مضمحل پہ ہنستے ہیں

بن باس

رات دن خواب بنتی ہوئی زندگی
دل میں نقدِ اضافی کی لَو
آنکھ بارِ امانت سے چور
موجِ خوں بے نیازِ مآل
دشتِ بے رنگ سے درد کے پھول چنتی ہوئی زندگی
خوفِ واماندگی سے خجل
آرزوؤں کے آشوب سے مضمحل
منہ کے بل خاک پر آ پڑی
ہر طرف اک بھیانک سکوت
کوئی نوحہ نہ آنسو نہ پھول

حاصلِ جسم و جاں بے نشاں رہگزاروں کی دھول
اجنبی شہر میں
خاک برسر ہوئی زندگی
کیسی بے گھر ہوئی زندگی!
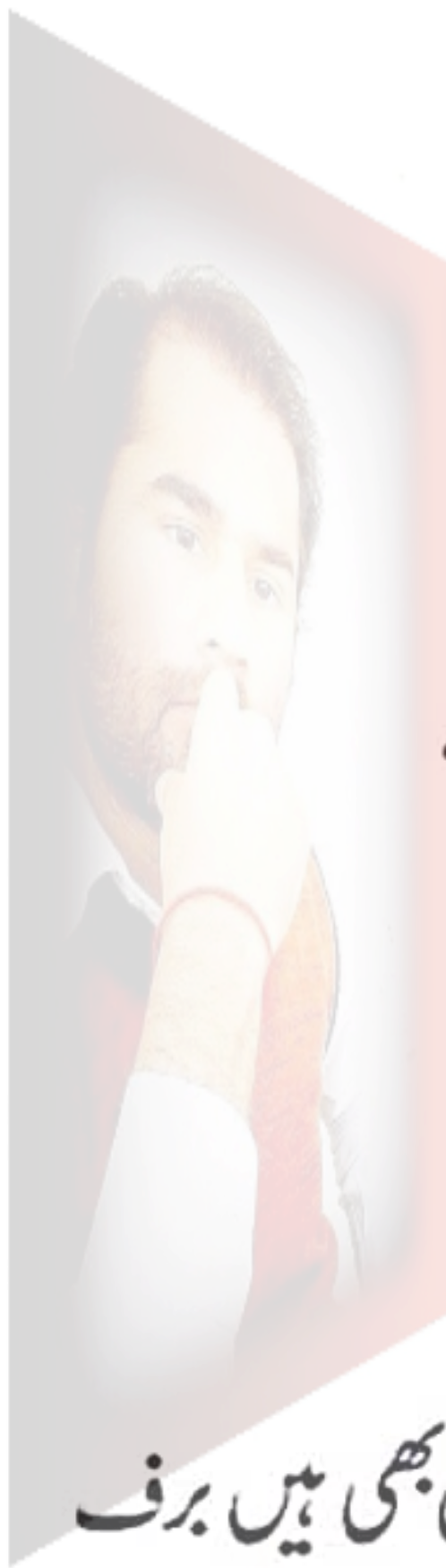
پس چہ باید کرد...

خوابِ خس خانہ و برفاب کے پیچھے پیچھے
گرمیِ شہرِ مقدر کے ستائے ہوئے لوگ
کیسی یخ بستہ زمینوں کی طرف آ نکلے

وجِ خوں برف ہوئی جاتی ہے سانسیں بھی ہیں برف
وحشتیں جن کا مقدر تھیں وہ آنکھیں بھی ہیں برف
بزمِ یارانِ دل آویز کا منظر بھی ہے برف
ایک اک نام، ہر آواز، ہر اک چہرہ برف
منجمد خواب کی ٹکسال کا ہر سکّہ برف

اور اب سوچتے ہیں، شام و سحر سوچتے ہیں

خوابِ خس خانہ و برفاب ۔ سے وہ آگ بھلی
جس کے شعلوں میں بھی قرطاس و قلم زندہ ہیں
جس میں ہر عہد کے ہر نسل کے غم زندہ ہیں
خاک ہو کر بھی یہ لگتا تھا کہ ہم زندہ ہیں

ایک رات کی کہانی

قصۂ شبِ دو ماہتاب
زندگی کا ایک عجیب باب
اک طرف حجابِ رنگ و نور
اک طرف جمالِ بے حجاب
آنکھ جب کھلی تو صبح دم
حجرۂ ہوس کے فرش پر
اک دیا بُجھا ہوا ملا
اک نظر جُھکی ہوئی ملی
ایک دل دُکھا ہوا ملا
قصۂ شبِ دو ماہتاب
زندگی کا ایک عجیب باب

رات کے دوسرے کنارے پر

جانے کیا بات ہے کہ شام ڈھلے
خوفِ نادیدہ کے اشارے پر
جھلملاتے ہوئے چراغ کی لو
مجھ سے کہتی ہے، "افتخار عارف!
رات کے دوسرے کنارے پر
ایک رات اور انتظار میں ہے"
کوئی چپکے سے دل میں کہتا ہے:
"رات پر اپنا بس چلے نہ چلے
خواب تو اپنے اختیار میں ہے!"

ستمبر کی یاد میں

اور تو کچھ یاد نہیں، بس اتنا یاد ہے
اس سال، بہار ستمبر کے مہینے تک آ گئی تھی
اُس نے پوچھا
"افتخار! یہ تم نظمیں ادھوری، کیوں چھوڑ دیتے ہو؟"
اب اُسے کون بتاتا کہ ادھوری نظمیں، اور ادھوری کہانیاں
اور ادھورے خواب
یہی تو شاعر کا سرمایہ ہوتے ہیں
پورے ہو جائیں تو دل اندر سے خالی ہو جاتا ہے
پھر دھوپ ہی دھوپ میں اتنی برف پڑی کہ بہت اونچا
اڑنے والے پرندے کے پر اس کا تابوت بن گئے
اور تو کچھ یاد نہیں بس اتنا یاد ہے
اس سال بہار ستمبر کے مہینے تک آ گئی تھی

کھوئے ہوئے ایک موسم کی یاد میں

سمائے ہیں مری آنکھوں میں خواب جیسے دن
وہ ماہتاب سی راتیں گلاب جیسے دن
وہ کنجِ شہرِ وفا میں سحاب جیسے دن

وہ دن کہ جن کا تصور متاعِ قریۂ دل
وہ دن کہ جن کی تجلّی فروغِ ہر محفل
گئے وہ دن تو اندھیروں میں کھو گئی منزل

فضا کا جبر شکستہ پروں پہ آ پہنچا
عذابِ در بدری بے گھروں پہ آ پہنچا
ذرا سی دیر میں سورج سروں پہ آ پہنچا

کسے دکھائیں یہ بے مائیگی خزینوں کی
کٹی جو فصل تو غربت بڑھی زمینوں کی
یہی سزا ہے زمانے میں بے یقینوں کی

نذرِ فیض

جو فیضؔ سے شرفِ استفادہ رکھتے ہیں
کچھ اہلِ درد سے نسبت زیادہ رکھتے ہیں

رموزِ مملکتِ حرف جاننے والے
دلوں کو صورتِ معنیٰ کشادہ رکھتے ہیں

شبِ ملال بھی ہم رہروانِ منزلِ عشق
وصالِ صبحِ سفر کا ارادہ رکھتے ہیں

جمالِ چہرۂ فردا سے سرخ رُو ہے جو خواب
اُس ایک خواب کو جادہ بہ جادہ رکھتے ہیں

مقامِ شکر کہ اس شہرِ کج ادا میں بھی لوگ
لحاظِ حرفِ دل آویز و سادہ رکھتے ہیں

بنامِ فیض، بجانِ اسد فقیر کے پاس
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

نذرِ جالب

میزانِ جنوں، لحنِ جنوں ساز ہے تیرا
معیارِ ہنر لہجۂ طنّاز ہے تیرا

ہم خلق سے منسوب، یہ عزّت ہے ہماری
تو خلق کا محبوب، یہ اعزاز ہے تیرا

ہر حبس میں ہے موجۂ خوشبو ترا انکار
ہر جبر میں انکار، سرافراز ہے تیرا

ہر چاک گریباں، ترے پرچم سے ہے ہم رنگ
ہر حلقۂ زنجیر ہم آواز ہے تیرا

منصور کے قامت سے شناسا تو ہوئی خلق
اے حرفِ سردار☆ یہ اعجاز ہے تیرا

☆ ۔ ''حرفِ سردار'' اردو مرکز لندن سے شائع ہونے والی کلیاتِ جالب

کوچ

جس روز ہمارا کوچ ہو گا
پھولوں کی دُکانیں بند ہوں گی
شیریں سخنوں کے حرفِ دُشنام
بے مہر زبانیں بند ہوں گی

پلکوں پہ نمی کا ذکر ہی کیا
یادوں کا سراغ تک نہ ہو گا
ہمواریِ ہر نفس سلامت
دل پر کوئی داغ تک نہ ہو گا
پامالیِ خواب کی کہانی
کہنے کو چراغ تک نہ ہو گا

معبود! اس آخری سفر میں
تنہائی کو سرخرو ہی رکھنا
جز تیرے، نہیں کوئی نگہدار
اُس دن بھی خیال تُو ہی رکھنا
جس آنکھ نے عمر بھر رُلایا
اُس آنکھ کو بے وضو ہی رکھنا

جس روز ہمارا کوچ ہو گا
پھولوں کی دُکانیں بند ہوں گی

ستمبر! راستہ دے

ستمبر! راستہ دے

کوئی چہرہ مری نامطمئن آنکھوں میں پھر کچھ خواب رکھنا چاہتا ہے
کوئی موسم مجھے شاداب رکھنا چاہتا ہے
بہت تپتے ہوئے صحراؤں کو سیراب رکھنا چاہتا ہے

ستمبر! راستہ دے

زمانہ جانتا ہے منہدم ہوتے ہوئے خوابوں کی دلداری میں کس حد تک گیا ہوں میں
ستمبر! بے یقیں رستوں پہ تنہا چلتے چلتے تھک گیا ہوں میں
کہیں پامال ہو جائے نہ پھر شہرِ مقدر، راستہ دے
کہیں معدوم ہو جائے نہ پھر اُمید کا کُھلتا ہوا در، راستہ دے
دلِ بے نور کے ساحل سے ٹکراتے ہوئے اندھے سمندر، راستہ دے

ستمبر! راستہ دے

ستمبر! راستہ دے!

ایک کہانی بہت پرانی

عجب دن تھے

عجب نامہرباں دن تھے، بہت نامہرباں دن تھے
زمانے مجھ سے کہتے تھے، زمینیں مجھ سے کہتی تھیں
میں اک بے بس قبیلے کا بہت تنہا مسافر ہوں
وہ بے منزل مسافر ہوں جسے اک گھر نہیں ملتا
میں اس رستے کا راہی ہوں جسے رہبر نہیں ملتا
مگر کوئی مسلسل دل پہ اک دستک دیے جاتا تھا، کہتا تھا، مسافر!
اس قدر نا مطمئن رہنے سے کیا ہوگا
ملال ایسا بھی کیا جو ذہن کو ہر خواب سے محروم کر دے
جمالِ باغِ آئندہ کے ہر امکان کو معدوم کر دے

گُلِ فردا کو فصلِ رنگ میں مسموم کر دے

دلا سے کی اِسی آواز سے ساری تھکن کم ہو گئی تھی اور

دل کو پھر قرار آنے لگا تھا

سفر، زادِ سفر، شوقِ سفر پر اعتبار آنے لگا تھا

میں خوش قسمت تھا

کیسی ساعتِ خوش رنگ و خوش آثار میں مجھ کو

مرے بے بس بہت تنہا قبیلے کو نیا گھر مل گیا تھا

ایک رہبر مل گیا تھا

ایک منزل مل گئی تھی اور امکانوں بھرا خوابوں سے، اُمیدوں سے روشن

ایک منظر مل گیا تھا

قائدؒ کے حضور

بے اثر ہو گئے سب حرف و نوا تیرے بعد
کیا کہیں دل کا جو احوال ہوا تیرے بعد

تو بھی دیکھے تو ذرا دیر کو پہچان نہ پائے
ایسی بدلی ترے کوچے کی فضا تیرے، بعد

اور تو کیا کسی پیماں کی حفاظت ہوتی
ہم سے اک خواب سنبھالا نہ گیا تیرے بعد

کیا عجب دن تھے کہ مقتل کی طرح شہر بہ شہر
بین کرتی ہوئی پھرتی تھی ہوا تیرے بعد

ترے قدموں کو جو منزل کا نشاں جانتے تھے
بھول بیٹھے ترے نقشِ کفِ پا تیرے بعد

مہر و مہتاب دو نیم ایک طرف خواب دو نیم
جو نہ ہونا تھا وہ سب ہو کے رہا تیرے بعد

یقین سے یادوں کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا

تم نے جو پھول مجھے رخصت ہوتے وقت دیا تھا
وہ نظم میں نے تمھاری یادوں کے ساتھ لفافے میں بند کر کے رکھ دی ہے
آج دنوں بعد بہت اکیلے میں اسے کھول کر دیکھا ہے
پھول کی نو پنکھڑیاں ہیں
(نظم کے نو مصرعے)
یادیں بھی کیسی عجیب ہوتی ہیں
پہلی پنکھڑی یاد دلاتی ہے اس لمحے کی جب میں نے
پہلی بار تمھیں بھری محفل میں اپنی طرف مسلسل تکتے ہوئے دیکھ لیا تھا
دوسری پنکھڑی — جب ہم پہلی بار ایک دوسرے کو کچھ کہے بغیر
بس یوں ہی جان بوجھ کر نظر بچاتے ہوئے ایک راہداری سے گزر گئے تھے

پھر تیسری بار جب ہم اچانک ایک موڑ پر کہیں ملے
اور ہم نے بہت ساری باتیں کیں اور بہت سارے برس
ایک ساتھ، پل بھر میں گزار دیے
اور چوتھی بار...
اب میں بھولنے لگا ہوں
بہت دنوں سے ٹھہری ہوئی اداسی کی وجہ سے شاید
کچھ لوگ کہتے ہیں اداسی تنہائی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے
ممکن ہے ٹھیک کہتے ہوں
کچھ لوگ کہتے ہیں بہت تنہا رہنا بھی اداسی کا سبب بن جاتا ہے
ممکن ہے یہ بھی ٹھیک ہو
ممکن ہے تم آؤ تو بھولی ہوئی ساری باتیں پھر سے یاد آ جائیں
ممکن ہے تم آؤ تو وہ باتیں بھی میں بھول چکا ہوں جو ابھی مجھے یاد ہیں
یادوں کے بارے میں اور اداسی کے بارے میں اور تنہائی کے بارے میں
کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی!

نذرِ اقبالؒ

فکرِ بلند و ذوقِ تماشا کہاں سے لائیں
اقبال جیسی زندہ تمنّا کہاں سے لائیں

زندانیانِ شکوہ و ماتم کے روبرو
بانگِ درا کی وضع کا مژدہ کہاں سے لائیں

دنیا بدل رہی ہے زمانے کے ساتھ ساتھ
اب روز روز دیکھنے والا کہاں سے لائیں

زرخیزیِ ہنر بھی ہے مشروط نم کے ساتھ
دل سنگ ہوں تو شورشِ گریہ کہاں سے لائیں

خوابِ گزشتگانِ محبت کے ذکر کا
چسکا ہمیں بھی ہے پہ سلیقہ کہاں سے لائیں

اسلوب میں تمازتِ خورشید کیسے آئے
لہجے میں بے کنارئِ صحرا کہاں سے لائیں

مخدوم مشترک ہیں مگر بزمِ خاص میں
ویسا مقام، اُن کا سا رُتبہ کہاں سے لائیں

اے شہرِ بے یقین کے موسم! جواب دے
فصلِ خزاں میں لالۂ تازہ کہاں سے لائیں

کہنے کو ہیں وراثتِ اقبالؒ کے امین
ہم کم نظر وہ دیدۂ بینا کہاں سے لائیں

غالبؔ کے دو مصرعے

ہمارے عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ کو
نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی تھی
مگر ہم کو نہیں آتی
ہمیں آتا بھی کیا ہے
خبر کے اُس طرف کیا ہے
کبھی اُس پر نظر رکھنے کا فن ہم کو نہیں آیا
نظر کے زاویے کس طرح سے ترتیب پاتے ہیں
کہاں اور کس لیے ترتیب پاتے ہیں
کبھی اِن زاویوں کو معتبر رکھنے کا فن ہم کو نہیں آیا
ہمیں بس خوئے ماتم راس آتی ہے

کوئی موجِ ہوائے تازہ کم کم راس آتی ہے
ہمارے عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ کو
نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی تھی
مگر ہم کو نہیں آتی!
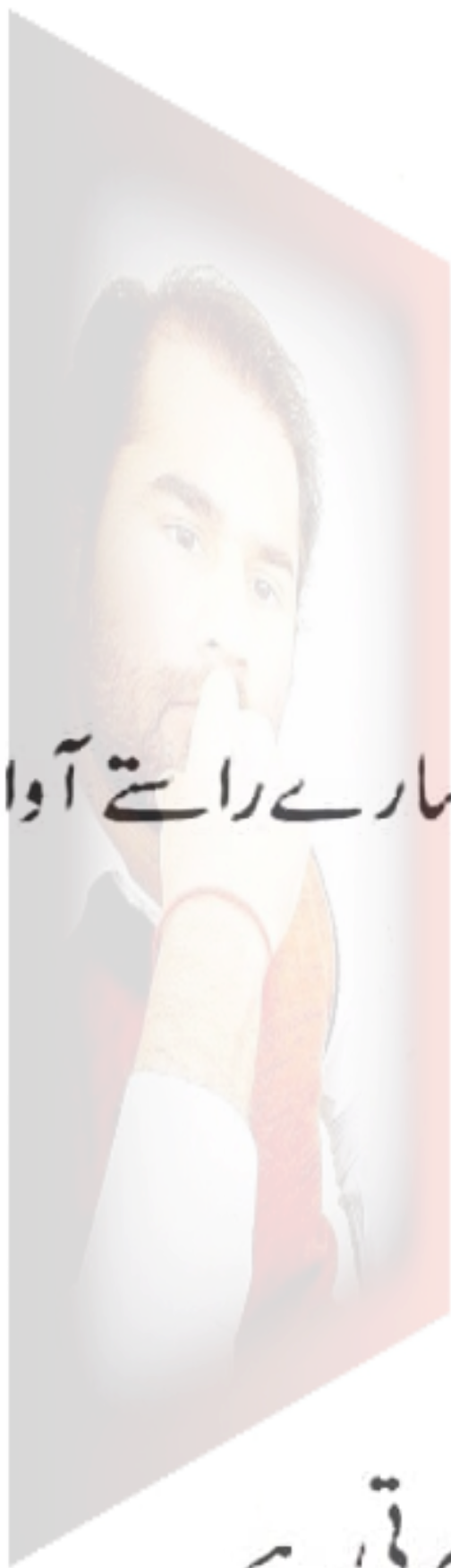
کچھ دیر پہلے نیند سے

میں جن کو چھوڑ آیا تھا شناسائی کی بستی کے وہ سارے راستے آواز دیتے ہیں
نہیں معلوم اب کس واسطے آواز دیتے ہیں
لہو میں خاک اُڑتی ہے
بدن، خواہش بہ خواہش، ڈھہہ رہا ہے
اور نفس کی آمد و شد دل کی ناہمواریوں پر بین کرتی ہے
وہ سارے خواب ایک اک کر کے رخصت ہو چکے ہیں جن سے آنکھیں جاگتی تھیں
اور امیدوں کے روزن شہرِ آئندہ میں کھلتے تھے
بہت آہستہ آہستہ
اندھیرا دل میں، آنکھوں میں، لہو میں، بہتے بہتے جم گیا ہے
وقت جیسے تھم گیا ہے

بس اب ایک اور شب، ایک اور پل جب سارے رستے بند ہوں گے
وہ پل جب سارے بندھن، کھڑکیاں، آنگن، اُمیدیں، آرزوئیں، رنگ سب
آہنگ سارے خاک کا پیوند ہوں گے
ادھر کچھ دن سے جانے کیوں اُسی پل کی اُسی ساعت کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں
بچھڑنے روٹھنے والوں کو پھر سے لوٹ آنے کی دُہائی دے رہی ہیں
مگر اب کون آئے گا، پلٹ کر کون آیا ہے جنھیں آنا تھا وہ تو آئے بھی اور
کب کے رخصت ہو چکے ہیں
میں سب کچھ جانتا بھی ہوں مگر پھر بھی
مری آنکھوں میں رستہ دیکھتے رہنے کی خواب بھی وہی ہے
تھکن سے چور ہوں پھر بھی سفر کی آرزو اب بھی وہی ہے
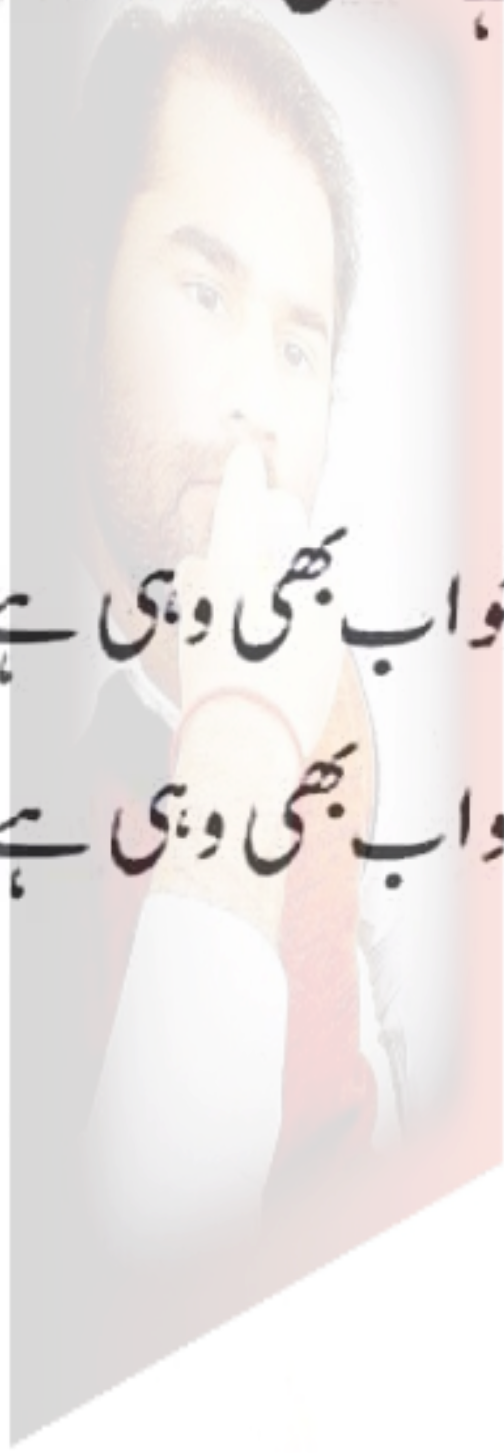
روشن دل والوں کے نام☆

دل کی آنکھ سے خیر کے سارے روشن منظر دیکھنے والو!

حدِ نظر تک پھیلی ہوئی سب روشنیوں، سارے رنگوں کو

ہات سے چھو کر دیکھنے والو!

بستی بستی، گلشن گلشن، ہنستی ہوئی ساری ہریالی

سب شادابی، دل کے اندر دیکھنے والو!

دل کے نور خزانوں کا ایک ایک چراغ جلائے رکھنا

امکانوں کے ہر کوچے میں، امیدوں کی ہر منڈیر پر

مستقبل کے ہر رستے میں، خواب کی جوت جگائے رکھنا

جگنو، سورج، چاند، ستارے

جب تک روشن ہیں یہ سارے

ہم آواز دیے جائیں گے

تم آواز ملائے رکھنا

☆ ستمبر میں نابینا افراد کے عالمی دن کے موقع پر

سلامی

(چند مصرعے شہید عزیز بھٹی کے لیے)

سیاہیِ شبِ ظلمت میں اک لہو کی لکیر
کھنچی اور ایسی کہ اب تک ہے روشنی ہر سمت
قلم کہ جس نے قصیدوں سے انحراف کیا
یہ چاہتا ہے کہ اس خون کو سلامی دے
(جزائے خیر و خراجِ بلند بامی دے)
جو خاکِ پاک کی نسبت سے ارجمند ہوا
مثالِ پرچمِ سر سبز سربلند ہوا
سوادِ نور کی سرحد پہ جاگتی ہوئی آنکھ
مرے شہید ترے جاوداں لہو کی جزا
مرے افق پہ مرے آفتاب روشن ہیں
بصد وقار و بصد آب و تاب روشن ہیں
مرا قلم، مرا دل، میرے خواب روشن ہیں

جمال احسانی کی یاد میں

ہوا بغیر دیے کا گزارا تھوڑی ہے
مگر یہ بات دیے کو گوارا تھوڑی ہے

وہ جس کسی نے بھی لکھا ہے ایک زندہ لفظ
فنا کی زد پہ ابھی آیا تو ہارا تھوڑی ہے

ہم اپنی دُھن میں چلے جا رہے ہیں خواب کے ساتھ
وگرنہ ہم کو کسی نے پکارا تھوڑی ہے

کچھ اہلِ دل سے ہے افتادگانِ خاک کا ذکر
پھر ان کے بعد یہ قصہ دوبارا تھوڑی ہے

شکستِ قیمتِ دل پر ملال کیا کہ یہاں
خسارہ ہو بھی تو ایسا خسارہ تھوڑی ہے

جہاں کی ریت مسافر کو راستہ بھی نہ دے
کچھ اور ہے وہ کنارا، کنارا تھوڑی ہے

بکھرنا رات کو اور صبح کو بہم ہونا
''یہ جھگڑا صرف ہمارا تمھارا تھوڑی ہے''

جمالؔ! اب جو بہت یاد آ رہے ہو تم
کمال اس میں بھی پیارے ہمارا تھوڑی ہے

فارسی طغراؔ ☆

اگر دانی کہ عالی خاندانم
نظر بر خاندانِ مصطفےٰ کن
اگر گوئی کہ گشتم در بلائے
نظر بر کشتگانِ کربلا کن
بہ دنیا گر کسے پایندہ بودے
ابوالقاسم محمدؐ زندہ بودے

آزاد ترجمہ

اگر کچھ زعم ہے نام و نسب پر
علوے خاندانِ مصطفےٰ دیکھ
اگر رنج و مصیبت سے ہے دل چُور
تو سُوئے کُشتگانِ کربلا دیکھ
اگر ارض و سما پائندہ ہوتے
ابوالقاسم محمدؐ زندہ ہوتے

☆ پندرہ برس قبل ایک سانحے پر یہ آزاد ترجمہ کیا گیا۔

فغانِ کشمیر

بین سنتا ہے نہ فریاد و فغاں دیکھتا ہے
ظلم انصاف کے معیار کہاں دیکھتا ہے

جان جاتی ہے کہ رہتی ہے یہ دنیا دیکھے
عشق کب مرحلۂ سود و زیاں دیکھتا ہے

خون میں ڈوبے ہوئے سجدہ گزاروں کا دیار
کوئی دن اور کہ اک تازہ جہاں دیکھتا ہے

موسمِ جبر کی بنیاد میں پلتا ہوا خوف
سرفروشوں میں وہی عزمِ جواں دیکھتا ہے

لوحِ امکاں پہ جو تحریر ہے اک خواب کا نقش
ہم نہ پڑھ پائیں جہانِ گزراں دیکھتا ہے

فتح و نصرت کی خبر خلقِ خدا سنتی ہے
جشنِ فردا کا سماں وقتِ رواں دیکھتا ہے

شاعرِ وادیِ لولاب کا یہ حلقہ بگوش
اسی وادی کی طرف شعلہ بجاں دیکھتا ہے

ترکش و تیغ نہ پیکان و سناں دیکھتا ہے
حرفِ حق جانبِ صاحب نظراں دیکھتا ہے

شہر آشوب

اے شہرِ رسن بستہ !
کیا یہ تری منزل ہے؟
کیا یہ ترا حاصل ہے؟
یہ کون سا منظر ہے؟
کچھ بھی تو نہیں کھلتا

کیا تیرا مقدر ہے؟
تقدیرِ فصیلِ شہر — کتبہ ہے کہ گلدستہ؟
اے شہرِ رسن بستہ !
اب کوئی بھی خوابوں پر ایمان نہیں رکھتا

کس راہ پہ جانا ہے کس راہ نہیں جانا، پہچان نہیں رکھتا

شاعر ہو کہ صورت گر، باغوں کی چراغوں کی بستی کے سجانے کا سامان نہیں رکھتا

جس سمت نظر کیجیے آنکھوں میں در آتے ہیں اور خون رُلاتے ہیں

یادوں سے بھرے دامن، لاشوں سے بھرا رستہ!

اے شہرِ رَسن بستہ!

مدّت ہوئی لوگوں کو چپ مار گئی جیسے

ٹھکرائی ہوئی خلقت جینے کی کشاکش میں جی ہار گئی جیسے

ہر سانس خجل ٹھہری، بے کار گئی جیسے

اب غم کی حکایت ہو یا لطف کی باتیں ہوں کوئی بھی نہیں روتا کوئی بھی نہیں ہنستا

اے شہرِ رَسن بستہ!
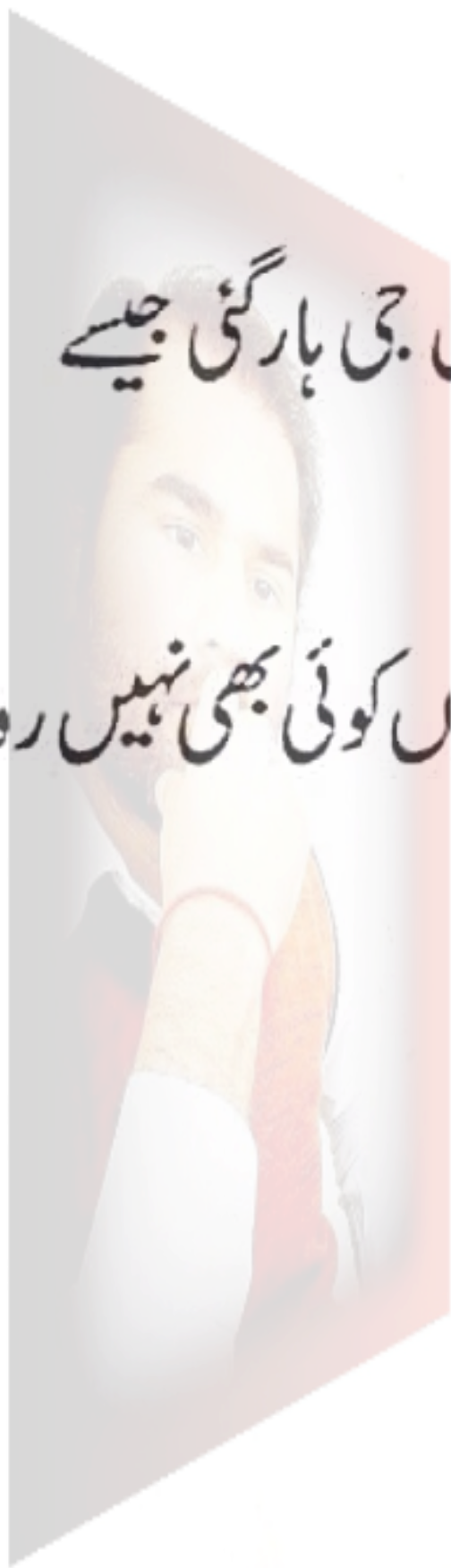
سہرا

کب سے سوچ رہا ہوں ڈولھا دریا خاں ترا سہرا لکھوں

تیرا سہرا میں کیا لکھوں

ہوشو اور ہیمو نے تیرے سہرے لکھے

سرخ لہو سے

کتنے اجلے کتنے روشن سہرے لکھے

میں کیا لکھوں

پھر بھی اک وعدہ کرتا ہوں

اب کے جب بھی دھمال پڑی تو

میں بھی تیرے ساتھ رہوں گا

میں تیرا سہرا لکھوں گا

ساتھ جیوں گا

ساتھ مروں گا!
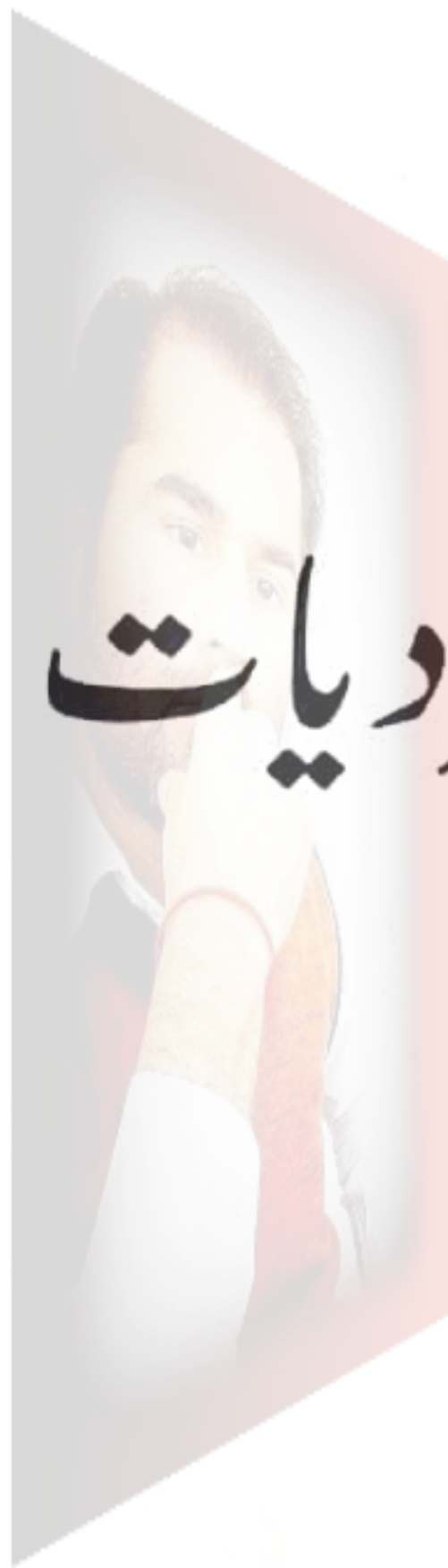
باب فردیات

الحمد لائبریری
فیس بک گروپ
کتابیں پڑھیے
سید حسین احسن
Imagitor

O

جو دل کی امانت ہے وہ منظر مرا بچ جائے
میں جاں سے گزر جاؤں مگر گھر مرا بچ جائے

کیا دن تھے کہ ہر معرکۂ صبر کے باوصف
مانگی تھیں دُعائیں کہ ستم گر مرا بچ جائے

اُس دن سے میں ڈرتا ہوں کہ جس دن سرِ مقتل
دستار سلامت نہ رہے سر مرا بچ جائے

○

کسی کے جور و ستم یاد بھی نہیں کرتا
عجیب شہر ہے فریاد بھی نہیں کرتا

کوئی تو ہے جو پرندوں کو بال و پر دے کر
زمیں کی قید سے آزاد بھی نہیں کرتا

○

فریب کھا کے بھی اک منزلِ قرار میں ہیں
مگر وہ لوگ کہ آسیبِ اعتبار میں ہیں

نہ جانے کون سی آنکھیں وہ خواب دیکھیں گی
وہ ایک خواب کہ ہم جس کے انتظار میں ہیں

○

آنگن میں سرسوں پھولی تھی مہک رہی تھی کیاری بھی
ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی تھی رنگ بھری پچکاری بھی

جیون پتھ پر چلتے چلتے ہم بھی تھک کر بیٹھ گئے
ساتھی میں بھی دھیرج کم تھا راہ میں تھی دُشواری بھی

○

بد گمانی میں کبھی گاہ خوش اندیشی میں
کٹ گئی عمر مراسم کی کمی بیشی میں

اور اک تازہ کتاب آئی نئے خواب کے ساتھ
اِک چراغ اور جلا حجرۂ درویشی میں

○

ہم بے در بے گھر لوگوں کی ایک دُعا بس ایک دُعا
مالک! شہرِ گلاب سلامت ہم پر جو بھی آئے عذاب

○

ہم سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان بہت شرمندہ ہیں

○

میں نے موجۂ آب پہ دو پتواریں بہتی دیکھی ہیں مولا خیر کرے
ڈری ڈری آنکھیں لہروں میں اُلجھی اُلجھی دیکھی ہیں مولا خیر کرے

○

ہم کہیں بھی ہوں چلے آئیں گے
شام ہو جائے تو گھبرانا نہیں

○

خاک میں شوکتِ پندار و انا ملتی ہے
اپنی مٹی سے بچھڑنے کی سزا ملتی ہے

○

بیٹیاں باپ کی آنکھوں میں چھپے خواب کو پہچانتی ہیں
اور کوئی دوسرا اس خواب کو پڑھ لے تو بُرا مانتی ہیں

○

جس دن سے ہم بلند نشانوں میں آئے ہیں
ترکش کے سارے تیر کمانوں میں آئے ہیں

○

جیسا جتنا بھی رشتہ تھا اُس کو رُسوا مت کرنا
ہم بھی ایسا نہیں کہیں گے تم بھی ایسا مت کرنا

○

خواب دیکھو اور پھر زخموں کی دلداری کرو
افتخار عارف☆! نئی منزل کی تیاری کرو

○

سمندر کے کنارے ایک بستی رو رہی ہے
میں اتنی دُور ہوں اور مجھ کو وحشت ہو رہی ہے

○

سفرِ شوق پہ احسانِ بہار ایسا ہے
رنگ اُڑتے نظر آتے ہیں غبار ایسا ہے

○

میں چاہتا تھا کہ سورج مری گواہی دے
سو میں نے رات کے آگے سپر نہیں ڈالی

☆۔ جہاں، افتخار عارف، اس طور پر آیا ہے، اہلِ علم سے اس کے لیے معذرت طلب ہوں۔

○

سفرِ شوق پہ احسانِ بہار ایسا ہے
رنگ اُڑتے نظر آتے ہیں غبار ایسا ہے

○

میں چاہتا تھا کہ سورج مری گواہی دے
سو میں نے رات کے آگے سپر نہیں ڈالی

○

کبھی سمندر پی جاتے تھے ایک سانس میں ہم
گئی رات تو اک کوزہ بھی دریا لگا ہمیں

○

یہ کون چھوڑ گیا رات کے اندھیرے میں
شکست کھائے ہوئے دشمنوں کے گھیرے میں

○

مالک درد کو محکم رکھنا ایک ہی غم کے ساتھ
جیسے مشک بہم رہتی ہے ایک علَم کے ساتھ
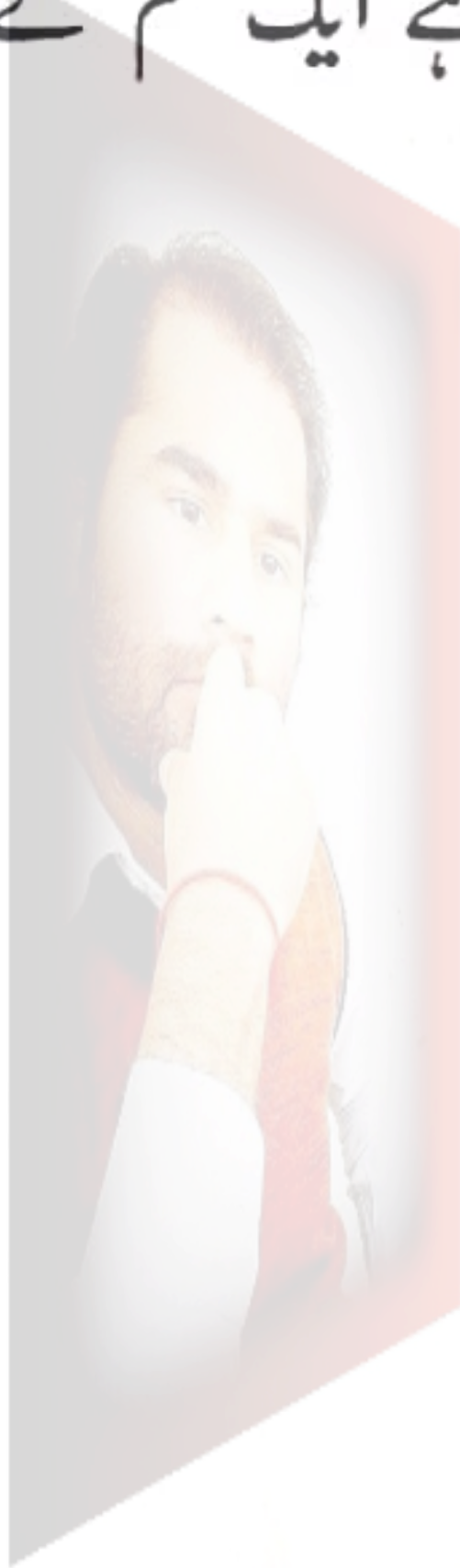
افتخار عارف میرے لیے انتظار کا نام ہے۔ ایک شاعر کا انتظار جسے میں پورے آدمیوں کی فہرست میں رکھ سکوں۔ اپنی نسل کے شعرا میں وہ سب سے سنجیدہ شاعر ہیں اور اپنے مواد اور فن دونوں میں ایک ایسی پختگی کا اظہار کرتے ہیں جو دوسروں میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

افتخار عارف کی شاعری ایک ایسے شخص کی شاعری ہے جو سوچنا، محسوس کرنا اور بولنا جانتا ہے جب کہ اس کے ہم عصروں میں بیشتر کا المیہ یہ ہے کہ یا تو وہ سوچ نہیں سکتے یا وہ محسوس نہیں کر سکتے اور سوچ اور احساس سے کام لے سکتے ہیں تو بولنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ اُن کی ان خصوصیات کی بنا پر جب میں ان کے کلام کو دیکھتا ہوں تو یہ احساس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ افتخار عارف کی آواز جدید اُردو شاعری کی ایک بہت زندہ آواز ہے۔ ایک ایسی آواز جو ہمارے دل و دماغ دونوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ہمیں ایک ایسی آسودگی بخشتی ہے جو عارف کے سوا شاید ہی کسی اور شاعر میں مل سکے۔

سلیم احمد

افتخار عارف جس روایت کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں اس میں آج کے عہد کی عظیم شاعری کے سارے امکانات پوشیدہ ہیں۔ امکانات خواب ہیں اور ان کی تعبیر شاعر کی تخلیق کی رہینِ منت ہے۔

سردار جعفری

افتخار عارف کا فن مجھے بحیثیت مجموعی پسند ہے، لیکن سب سے زیادہ جس خوبی نے مجھے ان کا گرویدہ بنایا وہ افتخار کا کھرا لہجہ ہے۔ پچھلے چند برسوں میں ہمارے درمیانی طبقے کے نقادوں نے جو طرح طرح کی اعصابی بیماریوں کا شکار ہیں، ترقی پسند شاعروں کے لہجے کی صلابت اور گھن گرج کے خلاف اتنا شور مچایا کہ بہت سے نوجوانوں نے اپنے لہجے کے بانکپن کو ایک طرح کی انفعالیت اور نسائیت سے بدل لیا۔ افتخار عارف نے ہر حالت میں اپنے لہجے کے بانکپن کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ ان کے احساس کی شدت، جذبے کے خلوص اور شعور کی حدت نے اس پر نئی دھار رکھ دی ہے۔

کیفی اعظمی

افتخار عارف نے اپنے شعری ہنر کو جذبہ وفہم کی اُس اکائی کے طور پر برتا ہے جو انفس و آفاق کی حقیقتوں اور گہرائیوں کے ادراک سے مرتب ہوتی ہے اور فکر و نظر کے وسیع تر دائرے قائم کرتی ہے۔ اُن کے لہجے کا اعتماد اور آواز کا استحکام بھی اُن کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ وہ اُن جدید شاعروں میں سے ہیں جن سے شاعری کا اعتبار قائم ہوتا ہے۔ افتخار عارف کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ ایک ایسا اسلوب بنانے اور لحن پانے میں کامیاب رہے ہیں جس میں شاعر کا احساسِ ذات اُس کے گردوپیش کی فضا سے بے نیاز نہیں ہوتا بلکہ اُسی سے توانائی حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی ذات اور اُن کا عہد ایک دوسرے کی پہچان بن گئے ہیں۔ شاعری میں یہ منصب کبھی کبھی اور کسی کسی ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

مشفق خواجہ